انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ

حیاتِ نو

دہلی

مدیر اعزازی رضوان احمد فلاحی

جلد ۷، شمارہ ۸—۹ | اگست — ستمبر ۲۰۲۲ء | محرم — صفر ۱۴۴۴ھ

ادارتی امور کے لیے رابطہ کریں: 9927206518،8287025094 | انتظامی امور کے لیے رابطہ کریں: 7011838453

ای میل:jareedahayatenau@gmail.com

فی شمارہ	:	اندرون ملک	۳۰/روپے
		بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
خصوصی شمارہ	:		۱۰۰ روپے
سالانہ زرتعاون	:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
		بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
		بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

مجلس ادارت

۱۔ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
۲۔عبداللہ زکریا فلاحی
۳۔تنویر آفاقی فلاحی
۴۔امتیاز وحید فلاحی
۵۔عبدالرحمن زریاب فلاحی
۶۔نجم الہدیٰ ثانی فلاحی
۷۔محمد انس فلاحی مدنی

ہمارے نمائندے

۱۔ظفر احمد اثری فلاحی، لندن
۲۔موسیٰ کلیم فلاحی، متحدہ عرب امارات
۳۔حسن حبیب فلاحی، نیپال
۴۔فیاض احمد فلاحی، قطر
۵۔محمد سموئیل فلاحی، کویت
۶۔ڈاکٹر انعام اللہ فلاحی، سعودی عرب
۷۔ذوالقرنین حیدر سبحانی، ملیشیا

★ رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگوانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

★ مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Hamdi ,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Printed at**: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor**: Rizwan Ahmad Falahi

نقوشِ حیات

اداریہ	شیخ الجامعہ مولانا سید جلال الدین عمری		
	رب ذوالجلال کے حضور	مدیر	۴
	چاند پر خاک ڈالنے کی 'دانشورانہ' کوشش	مدیر	۶
قرآن فہمی	اردو تراجم قرآنی پر ایک نظر	ڈاکٹر محی الدین غازی	۱۰
	تلاوت قرآن: مستقل مطلوب عمل	محمد انس فلاحی	۱۵
بحث ونظر	ہجرتِ مبارکہ: نتائج اور اسباق	ذکی الرحمان غازی مدنی	۲۲
	آزادی کا اسلامی تصور	نعمان بدر فلاحی	۳۱
	تحفظ شریعت، تحفظ حیات	نور الصباح فلاحی	۴۵
فکر وآگہی	بدلتا ہوا عالمی منظر نامہ اور امت مسلمہ کا مطلوبہ کردار	ڈاکٹر محمد ارشد فلاحی	۵۲
	مکالمہ بین المذاہب کی موجودہ صورت حال اور اسلامی نقطہ نظر	محمد صادر ندوی	۵۹
لسان وادب	اردو لکھنے میں کی جانے والی بارہ غلطیاں	ڈاکٹر معین الدین عقیل	۷۰
	نسیاً منسیاً کی کہانی: مولانا عامر عثمانی	عبداللہ زکریا فلاحی	۷۳
یادرفتگاں	ڈاکٹر خورشید عالم	ڈاکٹر طارق احسن فلاحی	۸۰
اخبار جامعہ	جامعہ کی متفرق خبریں	مصباح الباری فلاحی	۸۷
اخبار انجمن	مسابقہ مضمون نویسی، انجمن کے نئے سکریٹری	ادارہ	۹۵

❖❖❖

مقالہ نگاران

۱۔ ڈاکٹر محی الدین غازی فلاحی، سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

۲۔ محمد انس فلاحی مدنی، رکن ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۳۔ ذکی الرحمٰن غازی مدنی، استاد تفسیر وادب عربی، جامعۃ الفلاح

۴۔ نعمان بدر فلاحی، ریسرچ اسکالر، شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۵۔ نور الصباح فلاحی، معلّمہ کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح

۶۔ ڈاکٹر محمد ارشد فلاحی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

۷۔ محمد صادر ندوی، ریسرچ اسکالر، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۸۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل، شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی

۹۔ عبداللہ ذکریا فلاحی، ممبئی

۱۰۔ ڈاکٹر طارق احسن فلاحی، استاد طبیہ کالج، ورسوا، ممبئی

۱۱۔ مصباح الباری فلاحی، استاد جامعۃ الفلاح

۱۲۔ رضوان احمد فلاحی، مدیر حیاتِ نو

شیخ الجامعہ مولانا سید جلال الدین عمری رب ذوالجلال کے حضور

جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر، شریعہ کونسل (دہلی) اور ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (علی گڑھ) کے صدر اور جامعۃ الفلاح کے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) نیز متعدد کتابوں کے مصنف اور معروف عالم دین، مولانا سید جلال الدین عمری، ۲۶/اگست ۲۰۲۲ کو رفیق اعلی کے حضور حاضر ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ اتفاق بھی خوب ہے کہ جماعت اسلامی کا ۸۱واں یوم تاسیس، خدا کے یہاں مولانا مرحوم کی تاریخ وفات قرار پایا۔ ۸۱ سال قبل ۲۶/اگست ۱۹۴۱ کو ۷۵ افراد پر مشتمل قافلے نے جماعت اسلامی کے نام سے اپنے تحریکی سفر کا آغاز کیا جو الحمدللہ آج بھی اپنی منزل کے حصول کی جانب رواں ہے اور جس کی ہندوستان میں ۲۰۰۷ سے ۲۰۱۹ تک تین میقاتوں میں قیادت کی سعادت مولانا سید جلال الدین عمری رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں آئی۔

مولانا عمری مرحوم جنوبی ہند کی مشہور درس گاہ جامعہ دارالسلام سے فارغ ہوکر ۱۹۵۶ میں رام پور میں قائم جماعت اسلامی کے ادارہ تصنیف سے وابستہ ہوگئے نیز جماعت کی رکنیت اختیار کی۔ دونوں سے ان کی وابستگی 'وفاداری بشرط استواری' کی مثال رہی جن سے موت ہی نے اس تعلق کا خاتمہ کیا۔

راقم الحروف کا مرحوم سے پہلا لیکن غائبانہ تعارف ان کے مضمون 'کیا رام چندر جی اور کرشن جی خدا کے رسول تھے؟' (شائع شدہ ماہنامہ زندگی رام پور، جنوری اور فروری ۱۹۶۸) سے ہوا تھا جسے میں نے اسی زمانے میں بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا۔ اس مضمون پر رام پور کی عدالت میں مصنف اور ناشر کے خلاف مقدمہ بھی دائر ہوا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں مولانا مرحوم کی دو اور کتب، ''عورت — اسلامی معاشرہ میں' اور 'معروف ومنکر' پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اول الذکر مولانا مرحوم کی پہلی باقاعدہ اور بھرپور تصنیف ہے جس کی اہل علم نے خاصی پذیرائی کی۔ ادارہ تصنیف سے تعلق اور 'تحقیقاتِ اسلامی' کے مدیر

ہونے کے ناطے، مولانا مرحوم جماعت اسلامی ہند کے یکے از کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ ان تصانیف کا بڑا حصہ مفید اصلاحی وتربیتی کتابچوں پر مشتمل ہے۔ مولانا مرحوم کی کی ایک اہم خصوصیت جو انہیں معاصر علماء سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن سے روایتی علماء خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے آج کے سلگتے مسائل کا اسلام کی روشنی میں حل پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مرحوم کی تصنیفات ذہنی وفکری تربیت سازی میں اہم کردار ادا کرتی رہیں گی۔

جامعۃ الفلاح میں جب شیخ الجامعہ کا منصب قائم کیا گیا، اسی وقت سے مرحوم اس منصب پر فائز رہے۔ امارت سے سبکدوشی کے بعد مولانا کچھ وقت جامعہ میں گزار کر اس کے نظم ونسق کو بہتر کرنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن بڑھتے ہوئے جسمانی ضعف اور صحت کے مسائل اس خواہش کی تکمیل میں مانع ثابت ہوئے۔ تاہم دور رہتے ہوئے وہ جو کچھ کر سکتے تھے اس سے انہوں نے گریز نہیں کیا۔ ذمہ داران جامعہ مولانا کی بحیثیت شیخ الجامعہ خدمات پر بہتر طریقے سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔

مولانا مرحوم کی شخصیت متعدد الجہات تھی۔ ادارہ تصنیف کے سکریٹری، بعد ازاں صدر، جماعت اسلامی کے امیر، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر اور جامعۃ الفلاح کے شیخ الجامعہ اور ایک معتبر مصنف۔ امید ہے کہ ۱۸ ستمبر ۲۰۲۲ کو 'ادارہ تصنیف وتحقیق اسلامی، علی گڑھ' میں منعقد ہونے والے سیمنار میں مولانا مرحوم کی شخصیت کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے گا۔

اللہ تعالی مولانا عمری کی دعوتی، تحریکی، علمی وتصنیفی اور دیگر میدانوں میں انجام دی گئیں خدمات قبول فرمائے اور بہترین اجر سے نوازے، لغزشوں سے صرف نظر فرماتے ہوئے اپنی مغفرت کی چادر میں ڈھانپ لے اور بروز حشر انہیں نبی ﷺ کی معیت عطا فرمائے، نیز جماعت اسلامی ہند اور جامعۃ الفلاح کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ
ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي

چاند پہ خاک ڈالنے کی 'دانشورانہ' کوشش

کچھ عرصہ قبل کچھ غیر معروف یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے چند جہالت زدہ اور علم دشمن پروفیسروں نے وزیر اعظم ہند کو خط لکھ کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب شہید کی کتابوں کو اسلامک اسٹڈیز کے نصاب سے خارج کر دینے کا مطالبہ کیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان مصنفین کی کتابیں شدت پسندی اور خفیہ کارروائیوں کی ترغیب دیتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان نام نہاد دانشوروں نے دونوں مفکرین میں سے کسی کی بھی تحریر کردہ ایک سطر بھی نہیں پڑھی ہوگی۔ یہ مغرب کا سکھایا ہوا سبق ہے جسے رٹ کر ملک عزیز کے نام نہاد دانشور طوطوں کی طرح دہراتے رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں دانشوری یہی ہے کہ اسلام اور اسلامی مفکرین کے خلاف مغرب سے درآمد ہر فکر و خیال کو جی جان سے اپنا کر اپنی دانشوری کا قد اونچا کرنے کی کوشش کی جائے۔

عجب ہنر ہے کہ دانشوری کے پیکر میں
کسی کا ذہن، کسی کی زباں لیے پھرے

ان بے چارے 'سادہ لوح دانشوروں' کا مطالبہ اس لائق نہیں کہ اسے موضوع بحث بنایا جائے۔ ان کے بارے میں وہی کہنا مناسب ہے جس کی ترغیب ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ملتی ہے کہ ''اللهم اهد قومي فإنهم لا يعلمون''۔

تاہم اس منظر نامے کا جو بدترین اور انتہائی کریہہ و پست ترین پہلو ہے وہ ہے بہ عجلت تمام شاہ سے بڑھ کر شاہ پرستی کا عملی مظاہرہ۔ مذکورہ بالا خط وزیر اعظم کو بھیجا گیا اور تا حال اس پر کوئی حکومتی موقف سامنے نہیں آیا، لیکن ملک میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیم گاہ، لفظ مسلم جس کے نام کا تا حال جز و لازم ہے، اس کے ذمہ داروں نے بدترین بھگوا پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، شعبہ مطالعات اسلامی سے ان دونوں اسلامی مفکرین کی کتابیں خارج از نصاب کر دینے کا فیصلہ کر دیا۔ ان ذمہ داروں کے مخصوص رجحانات کا اندازہ کچھ نہ کچھ ضرور تھا، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی دانشوری کے 'پائے چوبیں' اس قدر دیمک زدہ اور کھوکھلے ہوں گے کہ محض ایک فضول مطالبے پر وہ یوں ڈھے جائیں گے۔ تف ہے ایسی دانشوری پر۔

یونیورسٹی کے اس علم دشمن فیصلے سے پہلے، اسی شعبہ کے ایک سینئر پروفیسر اور سابق چیئرمین نے پابندی کے مطالبہ کو یکسر غلط قرار دیتے ہوئے اس پر تنقید کی تھی، تو انہیں آئندہ اس پر کچھ کہنے سے روک دیا گیا۔ اس صورت حال کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ملک کے سنجیدہ اہل علم کی جانب سے اس پر کوئی ردعمل تا حال سامنے نہیں آیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

....

'حیات نو' کے گزشتہ شمارے کے اداریے میں ایک ایسے معاملے کی جانب ذمہ داران کی توجہ مبذول کرائی گئی تھی جسے پچیس سال قبل جامعہ کی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس میں پاس کرنے کے بعد سے فراموش کر رکھا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کسی مجبوری کے تحت اس فیصلے پر اب تک عمل درآمد نہیں ہو سکا تو کم از کم اب ذمہ داران اس جانب توجہ کریں اور اسے عملی جامہ پہنانے کی سعی کریں۔ اداریے کے مندرجات پر مثبت ردعمل سوشل میڈیا پر صرف ایک فلاحی اور ایک غیر فلاحی کا آیا۔ جب کہ توقع تھی کہ کم از کم تعلیم و تدریس سے وابستہ فلاحی حضرات ادارے کی بہبود کے پیش نظر اس کی تائید کریں گے۔ اداریہ کے آخر میں، محض ایک عمومی صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا گیا تھا کہ ذمہ داران جامعہ غیر تعلیمی اور غیر علمی مصروفیات کی طرف اپنی توجہ کم کرتے ہوئے جامعہ کے تعلیمی، اور علمی و تحقیقی منصوبوں کو بروئے کار لانے کی جانب زیادہ توجہ کریں گے۔ ایک ذمہ دار نے اصل موضوع کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے سوشل میڈیا پر سوال کیا کہ بھلا کن غیر تعلیمی وغیر علمی معاملات کی جانب ہماری توجہ زیادہ ہے۔ کاش اصل مسئلے پر بھی وہ کچھ لب کشائی فرماتے۔ اصل مسئلے کو نظر انداز کر کے محض ایک ضمنی بات کو مرکز توجہ بنالینا کوئی مستحسن رویہ نہیں ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

....

راقم کو اس کی منشا کے علی الرغم جب جریدہ حیات نو کی ادارت سونپی گئی تھی تو اسی وقت اس نے واضح کر دیا تھا کہ اسے عارضی انتظام سمجھا جائے اور جلد یہ ذمہ داری مناسب اور اہل شخص کے حوالے کی جائے۔ راقم کی، بھلی یا بری ادارت پر دس ماہ ہو چکے ہیں اور اسے برابر یہ احساس رہا کہ اس ذمہ داری کا حق ادا نہیں ہو پا رہا

ہے۔ اس کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ گرتی ہوئی صحت ہے۔ دوسری بڑی وجہ خود راقم کے اپنے علمی مشاغل اور منصوبوں کی تکمیل ہے۔ علالت کی 'ناز برداری' کے بعد جو کچھ وقت بچتا ہے وہ ان علمی مصرفیات کے لیے وقف ہے۔ ان حالات میں ایک نئی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا خود پر ظلم کرنا ہے۔

ادارت کا کام جز وقتی نہیں، ہمہ وقتی ہے۔ پوری ذمہ داری کے ساتھ کام کیا جائے تو ایک شمارے کی تکمیل کے لیے کم از کم بیس دن درکار ہیں۔ اور یہ اس وقت کہ جب اچھے مضامین مدیر کو دستیاب ہوں۔ ایک ایک مضمون کو بغور پڑھنا، قابل اشاعت مضامین کا انتخاب کرنا، زبان و بیان کی درستگی، مضمون کے کمزور حصوں کو مناسب حد تک بہتر بنانا وغیرہ، اچھے خاصے وقت کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہ مصروفیت مزید وقت کی طالب اور ہو جاتی ہے اگر مدیر کے اندر ایک چھوٹا سا تزئین کار (ڈیزائنر) بھی موجود ہو۔

موجودہ شمارہ میری ادارت میں آخری شمارہ ہے۔ اس کے بعد راقم اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوتا ہے۔ یہ سبکدوشی اور پہلے ہو جاتی، لیکن صدر انجمن کی ہدایت پر اگست رستمبر کے مشترک شمارہ ترتیب دینے تک ذمہ داری نبھانی تھی۔ اس عرصہ میں جن حضرات نے میرے ساتھ تعاون کیا، میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔ خاص طور سے میرے شکریے کے حق دار برادرم انس سنبھلی فلاحی (ادارہ تصنیف، علی گڑھ) ہیں جن کا مجھے توقع سے بڑھ کر تعاون حاصل رہا۔ زیر نظر شمارہ بڑی حد تک ان کا ہی مرتب کردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور میدان عمل میں انہیں کامیابیوں سے ہم کنار کرے۔

....

حیات نو ایک علمی مزاج کا حامل جریدہ ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین اپنے موضوع اور زبان و اسلوب کے اعتبار سے علمی ہونے چاہییں۔ ہمیں بعض مضامین ایسے بھی ملے ہیں جن کا موضوع علمی ہونے کے باوجود ان کی زبان اخباری اور غیر محاوراتی تھی۔ براہ کرم پوری کوشش کیجیے کہ مضامین کی زبان اخباری نہ ہو، بلکہ معیاری اور علمی ہو۔ اسی طرح بعض ایسے مضامین بھی موصول ہوئے جن میں عربی الفاظ استعمال کیے گئے تھے جب کہ ان کے اردو متبادل موجود اور مستعمل ہیں۔ امید ہے ان باتوں کا خیال رکھا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Anjuman Talaba-e-Qadeem
Jamiatul Falah

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

Ref No. .... Date 22/8/22

شیخ الجامعہ مولانا سید جلال الدین عمری کی کمی جامعہ میں ایک عرصہ تک محسوس کی جائے گی: صدر انجمن طلبہ قدیم

جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر اور جامعۃ الفلاح کے شیخ الجامعہ مولانا سید جلال الدین عمری صاحب مرحوم کی رحلت ہندوستان کی علمی "وفکری دنیا کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے۔ مولانا سید جلال الدین عمری مرحوم ہندوستانی علماء کے درمیان ایک نمایاں علمی مقام رکھتے تھے اور ملک بھر کے علمی وفکری حلقوں میں آپ کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نائب صدر تھے اور ملک وبیرون کے مختلف اہم ملی وعلمی اداروں سے وابستہ تھے۔ ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کے آپ ایک عرصے سے صدر تھے اور اس سے نکلنے والے علمی وتحقیقی مجلہ "تحقیقات اسلامی" کے مدیر تھے۔

مولانا سید جلال الدین عمری مرحوم نے عمر کی تقریباً سات دہائیاں علم وتحقیق کے میدان میں گزاریں، آپ زائد از تین دہائیوں سے جامعۃ الفلاح کی مجلس شوریٰ کے رکن، تقریباً ایک میقات تک جامعہ کے ناظم اور پھر زائد از دو دہائیوں سے جامعہ میں شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز تھے۔ مولانا عمری مرحوم جامعۃ الفلاح کے لیے شناخت اور پہچان کی حیثیت رکھتے تھے۔ یقیناً مولانا کی کمی جامعہ میں ایک عرصہ تک محسوس کی جائے گی۔ ہم فارغین جامعہ، وابستگان جامعہ، اور بہی خواہان جامعہ کو پورے اہتمام کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں دعا کرنی چاہیے کہ اللہ رب العزت مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے سرفراز فرمائے، اور جامعہ کو مولانا کا نعم البدل عنایت "فرمائے۔

ان خیالات کا اظہار مولانا سید جلال الدین عمری مرحوم کی رحلت پر صدر انجمن برادر ابوالاعلیٰ سید سبحانی فلاحی صاحب نے فرمایا۔ یقیناً مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن مولانا کی زندگی کا پیغام اور مولانا کا علمی وفکری ورثہ ہمارے درمیان موجود ہے، مولانا سے تعلق رکھنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ مولانا کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں اور مولانا کے علمی وفکری مشن کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں، واللہ ولی التوفیق

جاری کردہ:

فرحان اجمل فلاحی،

سکریٹری انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح بلریاگنج اعظم گڑھ

Bilariyaganj, Azamgarh, U.P. 276121
atq.jamiatulfalah@gmail.com | www.atqjamiatulfalah.org

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر

مولانا امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں

ڈاکٹر محی الدین غازی

(۱۸۸) شقاق کا ترجمہ

قرآن مجید میں شقاق کا لفظ اور اس سے مشتق فعل متعدد مقامات پر ذکر ہوئے ہیں۔ اہل لغت کی صراحت کے مطابق شقاق کا مطلب ہے، مخالف ہوجانا، دشمنی اختیار کرلینا۔

خلیل فراہیدی کے الفاظ میں: والشِّقَاقُ: الخلاف۔ (العین)

فیروزآبادی لکھتے ہیں: والمُشَاقَّةُ والشِّقاقُ: الخِلافُ، والعَدَاوَةُ۔ (القاموس المحیط)

راغب اصفہانی لکھتے ہیں: والشِّقَاقُ: المخالفة، وكونك فى شِقٍّ غير شِقِ صاحبك- (المفردات فی غریب القرآن)

تراجم قرآن کا جائزہ بتاتا ہے کہ اکثر جگہ اکثر مترجمین نے یہی مذکورہ مفہوم اختیار کیا، لیکن کچھ مترجمین نے کچھ مقامات پر اس سے کچھ مختلف مفہوم بھی ذکر کیا، جیسے جھگڑا کرنا، ضد کرنا، مقابلہ کرنا وغیرہ۔ گو کہ جھگڑا، ضد، جنگ، مقابلہ یہ سب مخالفت اور دشمنی سے نکلے ہوئے رویے ہیں، لیکن ان میں بہرحال فرق ہے، جسے ملحوظ رکھنا مناسب ہے۔

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ- (الأنفال: ۱۳)

''یہ اس لیے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کا مقابلہ کیا اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کا مقابلہ کرے اللہ اس کے لیے نہایت سخت گیر ہے''۔ (سید مودودی)

''یہ اس بات کی سزا ہے کہ انہوں نے اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی۔ اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے سو بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے''۔ (محمد جونا گڑھی)

''یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت

کرے تو بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے''۔(احمد رضا خان)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ - (محمد:۳۲)

''جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسول سے جھگڑا کیا جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی، در حقیقت وہ اللہ کا کوئی نقصان بھی نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا''۔(سید مودودی)

''بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا اور لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا اور ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد بھی پیغمبر سے جھگڑا کیا وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ہیں اور اللہ عنقریب ان کے اعمال کو بالکل برباد کردے گا''۔(ذیشان جوادی)

''جن لوگوں کو سیدھا رستہ معلوم ہو گیا (اور) پھر بھی انہوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) خدا کی راہ سے روکا اور پیغمبر کی مخالفت کی وہ خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے۔اور خدا ان کا سب کیا کرایا اکارت کر دے گا''۔(فتح محمد جالندھری)

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَنْ يُشَاقِّ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۔ (الحشر:۴)

''یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا، اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے''۔(سید مودودی)

''یہ اس لیے کہ انہوں نے خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کی۔اور جو شخص خدا کی مخالفت کرے تو خدا سخت عذاب دینے والا ہے''۔(فتح محمد جالندھری)

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تُشَاقُّونَ فِيهِمْ (النحل:۲۷)

''پھر قیامت والے دن بھی اللہ تعالیٰ انہیں رسوا کرے گا اور فرمائے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کے بارے میں تم لڑتے جھگڑتے تھے''۔(محمد جونا گڑھی)

''پھر قیامت کے روز اللہ اُنہیں ذلیل وخوار کرے گا اور اُن سے کہے گا" بتاؤ اب کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے لیے تم (اہل حق سے) جھگڑے کیا کرتے تھے؟''۔(سید مودودی)

''پھر وہ ان کو قیامت کے دن بھی ذلیل کرے گا اور کہے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کے بارے میں تم جھگڑا کرتے تھے''۔ (فتح محمد جالندھری)

''پھر قیامت کے دن انہیں رسوا کرے گا اور کہے گا میرے شریک کہاں ہیں جن پر تمہیں بڑی ضد تھی''۔ (احمد علی)

یہاں عام طور سے لوگوں نے جھگڑا کرنا ترجمہ کیا ہے۔ مناسب ترجمہ یہ ہے کہ: جن کی بنا پر تم نے مخالفت اور دشمنی اختیار کی تھی۔

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ۔ (النساء:۱۱۵)

''مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو''۔ (سید مودودی) یہاں عام طور سے لوگوں نے مخالفت کرنے کا ترجمہ کیا ہے۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ (البقرة:۱۳۷)

''پھر اگر وہ اُسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم لائے ہو، تو ہدایت پر ہیں، اور اگر اس سے منھ پھیریں، تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں''۔ (سید مودودی)

''پھر اگر وہ بھی یونہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منھ پھیریں تو وہ نری ضد میں ہیں''۔ (احمد رضا خان)

''اگر وہ تم جیسا ایمان لائیں تو ہدایت پائیں، اور اگر منھ موڑیں تو وہ صریح اختلاف میں ہیں''۔ (محمد جونا گڑھی)

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ۔ (البقرة:۱۷۶)

''اور اس کتاب میں اختلاف کرنے والے یقیناً دور کے خلاف میں ہیں''۔ (محمد جونا گڑھی)

''مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دور نکل گئے''۔ (سید مودودی)

''اور بے شک جولوگ کتاب میں اختلاف ڈالنے لگے وہ ضرور پرلے سرے کے جھگڑالو ہیں''۔(احمد رضا خان)

''اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا وہ ضد میں (آ کر نیکی سے) دور (ہو گئے) ہیں''۔(فتح محمد جالندھری)

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا۔ (النساء:۳۵)

''اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں اَن بن ہے''۔(فتح محمد جالندھری)

''اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو''۔(سید مودودی)

''اور اگر تم کو میاں بی بی کے جھگڑے کا خوف ہو''۔(احمد رضا خان)

''اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان آپس کی اَن بن کا خوف ہو''۔(محمد جونا گڑھی)

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ۔ (ص:۲)

''مگر جولوگ کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں''۔(فتح محمد جالندھری)

''بلکہ یہی لوگ، جنہوں نے ماننے سے انکار کیا ہے، سخت تکبر اور ضد میں مبتلا ہیں''۔(سید مودودی)

''بلکہ کافر تکبر اور خلاف میں ہیں''۔(احمد رضا خان)

''بلکہ کفار غرور و مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں''۔(محمد جونا گڑھی)

وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِنْكُمْ بِبَعِيدٍ۔ (ہود:۸۹)

''اور اے برادران قوم، میرے خلاف تمہاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ آخر کار تم پر بھی وہی عذاب آ کر رہے جو نوحؑ یا ہودؑ یا صالحؑ کی قوم پر آیا تھا اور لوطؑ کی قوم تو تم سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔'' (سید مودودی)

''اور اے میری قوم تمہیں میری ضد یہ نہ کموا دے کہ تم پر پڑے جو پڑا تھا نوح کی قوم یا ہود کی قوم یا صالح کی قوم پر، اور لوط کی قوم تو کچھ تم سے دور نہیں''۔(احمد رضا خان)

''اور اے قوم! میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کرا دے کہ جیسی مصیبت نوح کی قوم یا ہود کی قوم یا صالح

کی قوم پر واقع ہوئی تھی ویسی ہی مصیبت تم پر واقع ہو۔ اور لوط کی قوم (کا زمانہ تو) تم سے کچھ دور نہیں''۔ (فتح محمد جالندھری)

''اور اے میری قوم (کے لوگو!) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کو میری مخالفت ان عذابوں کا مستحق بنا دے جو قوم نوح اور قوم ہود اور قوم صالح کو پہنچے ہیں۔ اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور نہیں''۔ (محمد جونا گڑھی)

وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ۔ (الحج:۵۳)

''بیشک ظالم لوگ گہری مخالفت میں ہیں''۔ (محمد جونا گڑھی)

''حقیقت یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ عناد میں بہت دور نکل گئے ہیں''۔ (سید مودودی)

''اور بیشک ستمگار دُھر کے (پرلے درجے کے) جھگڑالو ہیں''۔ (احمد رضا خان)

''بے شک ظالم پرلے درجے کی مخالفت میں ہیں''۔ (فتح محمد جالندھری)

مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ۔ (فصلت:۵۲)

''بس اس سے بڑھ کر بہکا ہوا کون ہوگا جو مخالفت میں (حق سے) دور چلا جائے''۔ (محمد جونا گڑھی)

''اُس شخص سے بڑھ کر بھٹکا ہوا اور کون ہوگا جو اِس کی مخالفت میں دور تک نکل گیا ہو؟''۔ (سید مودودی)

''تو اس سے بڑھ کر گمراہ کون جو دور کی ضد میں ہے''۔ (احمد رضا خان)

''تو اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو (حق کی) پرلے درجے کی مخالفت میں ہو''۔ (فتح محمد جالندھری)

مذکورہ بالا آخری دونوں آیتوں میں شقاق بعید کی تعبیر ہے، جس کا صحیح مطلب مخالفت میں دور نکل جانا ہے، نہ کہ دور کی مخالفت میں ہونا۔ جس طرح ضلال بعید کا مطلب گمراہی میں دور نکل جانا ہے، نہ کہ دور کی گمراہی میں پڑنا۔

❖❖❖

تلاوتِ قرآن: مستقل مطلوب عمل

محمد انس فلاحی مدنی

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انہی میں سے انبیاء ورسل مبعوث کیے اوران پر فرشتوں کے ذریعہ کتب وصحائف نازل کیے۔ اس طرح ان کی صلاح وفلاح، رشد وہدایت کا سلسلہ ہر زمانہ جاری رہا، یہاں تک کہ اللہ نے سب سے اخیر میں حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اوران پر اپنا آخری پیغام قرآن مجید کی شکل میں نازل کیا۔ قرآن انسانی زندگی کے تمام مسائل ومصائب کا حل، علوم ومعارف کا خزینہ اور راہ نجات ہے۔ یہ عبد اور معبود کے درمیان ہم کلامی کا ذریعہ ہے۔ قرآن کسی خاص فن اور علم کی کتاب نہیں ہے۔ وہ انسان کی روحانی اور مادی زندگی دونوں سے بحث کرتا ہے۔ جہاں اس میں آخرت میں نجات اور کامیابی کے اصول بتائے گئے ہیں، وہیں اس میں دنیوی زندگی کو بہتر بنانے اور برتنے کے گر بھی سکھائے گئے ہیں۔

قرآن مجید سے فیض اٹھانے کے لیے اس سے وابستگی لازمی ہے۔ تمسک بالکتاب کے بغیر ہدایت ممکن ہے نہ بندگی کا صحیح طریقہ معلوم ہوسکتا ہے۔ قرآن مجید کے حقوق بیان کیے گئے ہیں اور اس کے فضائل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کو، پڑھنے اور سننے پر اجر کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ انسان قرآن کے پیغام کو سمجھے اور اس کے اندر عمل کا داعیہ پیدا ہو، کیوں کہ قرآن کو سمجھے بغیر اس پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ اپنے مضامین پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اور آفاق وانفس کی نشانیاں بیان کرتا ہے۔

قرآن فہمی کے لیے متعدد امور ضروری ہیں۔ مثلاً اس کی تلاوت کرنا، ترجمہ پڑھنا، مختلف تفاسیر کا مطالعہ کرنا اور دروسِ قرآن کے ذریعہ پیغامِ الٰہی کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ یہ سب لازمی اعمال ہیں، لیکن بعض حلقوں میں قرآن فہمی پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ تلاوتِ قرآن کو ثانوی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کرنا مطلوب اور مستحسن عمل نہیں ہے، اصل مطلوب ومقصود قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور اسے سمجھ کر پڑھنا دونوں مستقل مطلوب اعمال ہیں۔ قرآن مجید کے مجید جو حقوق بیان کیے گئے ہیں ان میں، تلاوت کرنا بھی شامل ہے۔ نور الدین عتر الحلبی اپنی کتاب 'علوم القرآن الکریم' میں رقم طراز ہیں:

''قرآن مجید کے تمام انسانوں پر حقوق یہ ہیں کہ اس پر ایمان لائیں، قرآن مجید کی عظمت کو تسلیم کریں، تمام اصول وقواعد کی رعایت کرتے ہوئے اس کی تلاوت کریں، سمجھنے کی کوشش کریں اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دیں۔'' [1]

تلاوت اور قراءت میں فرق

لسان العرب میں قراءت کے لغوی معنٰی یہ درج ہیں: 'قرأت الشئی قرأناً: جمعته و ضممت بعضه الی بعض ،و قرأت القرآن،لفظت به مجموعاً،أی القیته۔ آگے لکھا ہے :والأصل فی هذه اللفظة الجمع ، فکل شئی جمعته فقد قرأته ،وسمی القرآن،لأنه جمع القصص ،والامر ، النهی ،الوعد والوعید والآیات والسور بعضها الی بعض ،یعنی قرأت کے لغوی معنی جمع کرنا ،ملانا۔۔۔قرآن کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کیوں کہ اس میں قصص، امر ونہی ، وعید اور وعدہ ، آیات اور سورتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ [2]

تلا یتلو ،تلاوۃ یعنیء قرأ قرأة وقوله تعالی:الَّذِیْنَ آتَیْنَاهُمُ الْکِتَابَ یَتْلُوْنَهُ حَقَّ تِلاَوَتِه} معناه یتبعونه حق اتباعه ویعملون به حق عمله ،وقوله عزوجل {وَاتَّبَعُواْ مَا تَتْلُواْ الشَّیَاطِیْنُ عَلَی مُلْكِ سُلَیْمَانَ، قال عطاء :علی ماتحدث وتقصّ ،وقیل ، ماتتکلم به کقولك فلان یتلو کتاب الله أی یقرؤه ویتکلم به۔ تلاوت کے معنی پڑھنا ہیں۔عطاء کہتے ہیں کہ تلاوت کا مطلب ہے جو بیان کیا جائے ، یا جو کچھ بولا جائے۔ [3]

امام راغب اصفہانیؒ کہتے ہیں: تلاوت مصدر ہے،جس کے معنی پیچھے چلنا، اقتدا اور اتباع کرنے کے ہیں۔ تلاوت کا لفظ کتاب اللہ کی قراءت اور اس کے امر ونہی ،ترغیب وترہیب کی پابندی کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔قراءت مطلق پڑھنے کے لیے بولا جاتا ہے۔تلاوت میں قراءت کا مفہوم شامل ہے لیکن قراءت میں تلاوت کا مفہوم شامل نہیں ہے۔ [4] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ایک اعتراض کے جواب میں لفظ ''تلاوت'' کے لغوی مفہوم پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''لفظ تلاوت کو ایک اصطلاح کے طور پر صرف ''تلاوت'' کے معنی میں مخصوص کرنا بعد کے اہل علم کا فعل ہے،جس کی بنا پر ''وحی متلو'' اور ''وحی غیر متلو'' کی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔قرآن میں تلاوت کا لفظ مجرد پڑھنے کے معنی میں آیا ہے، اصطلاح کے طور پر آیات کتاب کے لیے مخصوص

نہیں کیا گیا ہے۔

دلیل میں مولاناؒ نے وَاتَّبَعُواْ مَا تَتْلُواْ الشَّيَاطِينُ عَلَى مُلْكِ سُلَيْمَانَ (البقرہ:۱۰۲) آیت پیش کی ہے۔۵ ''

قرآن مجید میں ''تلاوت'' اور ''قراءت'' کے الفاظ قرآن پڑھنے اور پڑھ کر سنانے کے معنی میں مستعمل ہوئے ہیں۔ارشاد باری تعالی ہے:

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَداً (الکھف:۲۷)

''اے نبیؐ! تمھارے رب کی کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے اسے (جوں کا توں) سنادو کوئی اس کے فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں ہے (اور اگر تم کسی کی خاطر اس میں ردّ و بدل کروگے تو) تو اس سے بچ کر بھاگنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پاؤ گے۔''

اتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاء وَالْمُنكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ (العنکبوت:۴۵)

''(اے نبیؐ) تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمھاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو، یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے۔''

وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ فَمَنِ اهْتَدَى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ (النمل:۹۲)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں۔اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا۔''

وَإِذَا قُرِىءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُواْ لَهُ وَأَنصِتُواْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الاعراف:۲۰۴)

''جب قرآن تمھارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو، شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔''

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (النحل:۹۸)

''پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔''

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِالآخِرَةِ حِجَاباً مَّسْتُوراً (بنی اسرائیل:۴۵)

''جب تم قرآن پڑھتے ہوتو ہم تمھارے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کردیتے ہیں۔''

فَاقْرَؤُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَى وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَاقْرَؤُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (مزمل:۲۰)

''اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں، اور کچھ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو۔''

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۔فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ (القیامۃ:۱۷۔۱۸)

''اس کو یاد کرادینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو۔''

وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ (الانشقاق:۲۱)

''اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے؟''

اول الذکر چار آیات میں قرآن پڑھنے اور پڑھ کر سنانے (پیغام پہنچانے) دونوں معنی میں آیا ہے۔آخر الذکر چھ آیات میں قرأۃ مصدر سے مطلق پڑھنے کو ر پڑھ کر سنانے کے معنی میں آیا ہے۔ان آیات کے علاوہ البقرہ:۱۱۳، ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران: ۱۱۳، ۱۶۴، النساء: ۱۲۷، المائدہ:۱، ھود: ۱۷ اسراء: ۱۰۷ میں بھی تلاوت پڑھنے اور پڑھ کر سنانے کے معنی میں آیا ہے۔ان آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تلاوت (مجرد پڑھنا اور سمجھ کر پڑھنا) دونوں مقصود بالذات ہیں۔یہاں یہ واضح رہے کہ آگے لفظ تلاوت سے مراد مجرّد تلاوت ہی ہے۔

تلاوت قرآن کے فضائل

قرآن کریم کی تلاوت کی بے شمار فضائل آیات قرآنی اور احادیث نبوی ﷺ میں بیان ہوئے ہیں۔ارشاد

باری تعالیٰ ہے:۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرّاً وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُور (فاطر:۲۹)

''جولوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، یقیناوہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا۔''

احادیث نبوی ﷺ میں قرآن سے مضبوط تعلق پیدا کرنے کے لیے اسے پڑھنے، پڑھ کرسنانے اور سکھانے اور اس کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ چند احادیث ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَه۶؎ ''تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کریں اور (دوسروں) کو اس کی تعلیم دیں۔''

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''جو شخص کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھتا ہے اس کے بدلے میں اس کی ایک نیکی شمار ہوتی ہے۔ اور ہر نیکی کے بدلے دس گنا اجر ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ الم ایک حرف ہے۔نہیں، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔''۷؎

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا-الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَهُوَ مَاهِرٌ بِهِ، فَهُوَ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ، وَالَّذِي يَقْرَؤُهُ وَهُوَ يَشْتَدُّ عَلَيْهِ، فَلَهُ أَجْرَان۸؎ '' قرآن کا ماہر قرآن کے لکھنے والے معزز اور پاکیزہ فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص قرآن کو اٹک اٹک کر اور بڑی مشکل سے پڑھتا ہے اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔''

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَالأُتْرُجَّةِ، طَعْمُهَا طَيِّبٌ وَرِيحُهَا طَيِّبٌ، وَمَثَلُ الَّذِي لَا يَقْرَأُ كَالتَّمْرَةِ، طَعْمُهَا طَيِّبٌ وَلَا رِيحَ لَهَا، وَمَثَلُ الْفَاجِرِ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الرَّيْحَانَةِ، رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ، وَمَثَلُ الْفَاجِرِ الَّذِي لَا

يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الحَنْظَلَةِ، طَعْمُهَا مُرٌّ وَلَا رِيحَ لَهَا

''جومومن قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ترنج کی سی ہے کہ اس کی خوشبو بھی عمدہ ہوتی ہے اور اس کا مزہ بھی اچھا ہوتا ہے اور جو مومن قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کی سی ہے کہ اس کی خوشبو تو نہیں ہوتی البتہ مزہ اس کا میٹھا ہوتا ہے۔ اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال خوشبو دار پھول کی سی ہے کہ اس میں خوشبو تو ہوتی ہے لیکن مزہ کڑوا ہوتا ہے۔ اور جو منافق قرآن نہیں پڑھتا ہے اس کی مثال حنظل (ایلوا) کی سی ہے کہ اس کی خوشبو بھی کوئی نہیں ہوتی اور اس کا مزہ بھی کڑوا ہوتا ہے۔''

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اقْرَؤُا الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيعًا لِأَصْحَابِهِ[10]۔ قرآن مجید پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لیے شفیع (سفارش کرنے والا) بن کر آئے گا۔''

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ عَلَّمَهُ اللَّهُ الْقُرْآنَ، فَهُوَ يَتْلُوهُ آنَاءَ اللَّيْلِ، وَآنَاءَ النَّهَارِ[11]۔ ''کسی حسد (یعنی رشک) کی گنجائش نہیں ہے مگر دو آدمیوں پر۔ ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم دیا ہوا اور وہ شب و روز اس کی تلاوت کرے۔''

مذکورہ بالا احادیث میں قرآن پڑھنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ قرآن پڑھنے، سمجھنے اور سیکھنے اور سکھانے والے شخص کو سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے اور تلاوت قرآن کے اجر کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان احادیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تلاوت قرآن (مطلق پڑھنا) بھی فی نفسہ مطلوب عمل ہے۔

نبی ﷺ نے تلاوت قرآن کو ایک مستقل مطلوب عمل کی حیثیت سے صحابہ کرامؓ کے سامنے پیش کیا ہے۔ محدثین نے اسی کے پیش نظر فضائل القرآن کے ذیل میں قرأۃ القرآن کا باب باندھا ہے۔ اور اس کے تحت متعدد احادیث نقل کی ہیں۔

قرآن سمجھ کر اور بغیر سمجھ کر پڑھنا دونوں قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے بیٹے عبداللہ بن احمد اپنے والد کا خواب بیان کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں؛ میں نے اپنے رب سے پوچھا کہ تیرے قرب کا افضل طریقہ کیا ہے؟۔ رب نے کہا؛ ''میرے کلام کے ذریعہ''، امام احمد نے پوچھا

سمجھ کر یا بغیر سمجھے؟ رب نے فرمایا: ''سمجھے اور بغیر سمجھے دونوں طرح سے۔''۱۲؎

تلاوت قرآن سے متعلق کتابیں

کتب ستہ کی طرح سلف صالحین نے اپنی کتابوں میں عبادات کے ذیل میں تلاوت قرآن کے فضائل، باطنی اور ظاہری آداب پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے۔امام غزالیؒ (ف:۵۰۵ھ) نے اپنی کتاب 'احیاء علوم الدین' ۱۳؎ میں 'آداب تلاوۃ القرآن' کے عنوان سے مفصل بحث کی ہے۔اس سلسلے میں سب سے اہم کتاب امام نوویؒ (ف:۶۷۶ھ) کی کتاب 'التبیان فی آداب حملۃ القرآن' ہے۔۱۴؎ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔اس میں تلاوت قرآن کی فضیلت، اہل قرآن کا اکرام وتعظیم، معلم قرآن کا ادب، حامل قرآن کے اوصاف، آداب قرآن اور قرآن سے متعلق دیگر چیزوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

امام قاسم بن سلامؒ (ف:۲۲۴ھ) نے اپنی کتاب 'فضائل القرآن' ۱۵؎ میں تلاوت قرأت کے فضائل و احکام سے متعلق احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ابن ضریسؒ (ف:۲۹۴ھ) نے اپنی کتاب 'فضائل القرآن وما انزل من القرآن بمکۃ وما انزل بالمدینۃ' ۱۶؎ میں تلاوت کے فضائل کے ساتھ قرآنی سورتوں کے فضائل بھی قلم بند کیے ہیں۔فریابیؒ (ف:۳۰۱ھ) کی 'فضائل القرآن' ۱۷؎ میں بھی قرأت قرآن کے فضائل ذکر کیے گئے ہیں۔اس سلسلے میں ایک اہم کتاب امام رازیؒ (و:۴۵۴ھ) کی 'فضائل القرآن و تلاوتہ' ہے۔ ۱۸؎ اس میں امام رازی نے حفظِ قرآن، تعلیم قرآن اور تلاوتِ قرآن سے متعلق متعدد احادیث کو جمع کیا ہے۔شیخ ابوانس محمد بن فتحی آل عبدالعزیز نے اپنی کتاب 'فتح الرحمن فی بیان ھجر القرآن' ۱۹؎ کے باب چہارم میں تلاوت قرآن کے فضائل، باب پنجم میں تلاوت قرآن کے آداب واحکام پر بحث کی ہے۔

دوسری قسط اگلے شمارے میں ملاحظہ کیجیے۔

ہجرتِ مبارکہ: نتائج اور اسباق

ذکی الرحمٰن غازی مدنی

اللہ کے رسول ﷺ کا مدینہ منورہ ہجرت کرنا اہلِ ایمان کے لیے فتح مندی وکامرانی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ اسلامی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ تاریخ میں پہلا اہم ترین واقعہ تو اس وقت پیش آیا جب محمدؐ بن عبد اللہ ﷺ پر پہلی بار قرآنِ کریم کا نزول ہوا، اور دوسرا اہم ترین واقعہ بلا کسی اختلاف ونزاع کے ہجرتِ مبارکہ کو قرار دیا جاتا ہے۔

مدینہ منورہ ہجرت کے بعد ہی ممکن ہوسکا کہ اسلام اپنے غلبہ ونفاذ کے دور میں داخل ہوجائے اور اہلِ ایمان امن واستقرار کے ماحول میں ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کے خواب کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ یہ ہجرتِ مبارکہ کا فیضان تھا کہ اب دینِ فطرت نظریاتی وفکری دائروں سے نکل کر واقعیت وتطبیق کے دائرے میں داخل ہوگیا۔ اب ایک اسلامی معاشرہ وجود پذیر ہوگیا جہاں اسلامی نظامِ حیات اپنی تمام تر باریکیوں، سعادتوں اور برکتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوسکا۔ ہجرت کی وجہ سے اسلام ایک روحانی سرچشمہ قوت، ایک نظامِ حکومت، ایک نافذ شدہ قانون وعملی منشور اور ایک مجسم دستورِ اخلاق بن گیا۔

ہجرتِ مبارکہ ایک طور سے اسلام اور نبی اسلام ﷺ کے لیے اللہ کی طرف سے عطا ہونے والی فتح عظیم اور بڑی کامیابی تھی۔ یہ آنے والی متعدد عظیم فتوحات کا حرفِ آغاز تھی جن کو مجاہدینِ اسلام نے بدر، مکہ اور حنین وغیرہ کے کارزاروں میں رقم کیا۔ اگر ہجرت کا وجود اسلامی تاریخ سے ہٹا دیا جائے تو تاریخ نگاری کے لیے مسلمانوں کے پاس کچھ زیادہ نہیں بچتا۔ بعثتِ رسول ﷺ سے پہلے کی عرب دنیا کا رواج تھا کہ بڑے بڑے حوادث وواقعات سے تاریخ کو مربوط کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر قبیلۂ قریش کی تاریخ نگاری میں جنگِ فجار، حلف الفضول، یومِ تحکیم، حادثۂ فیل، وفاتِ ہشام بن مغیرہ اور ملوکِ حمیر کے ساتھ قبیلہ بنو یر بوع کی غداری جیسے چند تاریخی واقعات شاہراہِ تاریخ کے سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے تھے۔

بعثتِ رسول ﷺ کے بعد متعدد عظیم الشان واقعات رونما ہوئے لیکن قریش نے انہیں لائقِ التفات نہ سمجھا کہ یہ واقعات اسلامی تھے۔ مثال کے طور پر قرآنِ کریم کا نزول، اسراء ومعراجِ رسول ﷺ، سفرِ طائف

اور ابوطالب وحضرت خدیجہؓ کا سانحۂ وفات وغیرہ ایسے نمایاں واقعات ہیں جن کو تاریخ میں خاص جگہ دی جاسکتی تھی، مگر نہیں دی گئی کیونکہ یہ واقعات اپنے آپ میں اسلامی تھے۔ ہجرت کے بعد بھی عام مسلمانوں نے تاریخی ترتیب کے لیے ایسے واقعات کا سہارا لیا جو ہجرت کے بعد پیش آئے تھے۔ اس طرح مابعدِ ہجرت سالوں میں سے ہر سال کا کوئی مخصوص نام تجویز کرلیا گیا۔

مثلاً ہجرت کے پہلے سال کو سنۃ الاذن یعنی ہجرت کی اجازت کا سال مانا گیا۔ دوسرے سال کو سنۃ الامر یعنی حکمِ قتال کا سال موسوم کیا گیا، کیونکہ اسی سال غزوہ بدر پیش آیا، تحویلِ قبلہ ہوئی اور اہلِ ایمان پر روزے فرض کیے گئے۔ تیسرے سال کو سنۃ التمحیص یعنی چھان پھٹک کا سال قرار دیا گیا کیونکہ اس سال میں غزوۂ احد پیش آیا تھا جس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مخلص وصادق اہلِ ایمان کا تزکیہ وتطہیر فرمائی تھی۔ ہجرت کے بعد چوتھے سال کو سنۃ الترفئۃ یعنی اصلاحِ حال کا سال مانا گیا کہ اس میں شراب نوشی کی حرمت نازل ہوئی اور یہودی قبیلہ بنونضیر کو بالکلیہ جلاوطن کیا گیا۔ پانچویں سال کا نام سنۃ الزلزال یعنی زلزلہ والا سال رکھا گیا کہ اس میں غزوۂ دومۃ الجندل، غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ پیش آئے تھے، نیز اسی سال میں واقعۂ افک کی تہمت بھی باندھی گئی تھی جس کو قرآنی وحی نے مسترد کردیا۔

چھٹے سال کو سنۃ الاستئناس یعنی قریب کرنے اور انس پیدا کرنے کا سال مانا گیا کیونکہ اسی سال میں صلحِ حدیبیہ اور بیعتِ رضوان وقوع پذیر ہوئے اور اسی سال میں آتش پرست ایرانیوں پر عیسائی رومیوں کے غلبہ پانے کا اللہ کا وعدہ (سورۂ روم: ۶-۱) پورا ہوا۔ ساتویں سال کا نام سنۃ الاستغلاب یعنی غلبہ حاصل کرنے کا سال مانا جاتا ہے کیونکہ اسی سال میں غزوۂ خیبر پیش آیا تھا اور اسی سال میں اللہ کے رسول ﷺ نے اسلام کی دعوت کو دنیا کے تمام ملوک وسلاطین تک پہنچانے کے لیے مختلف نمائندوں کو اپنے خطوط کے ساتھ بھیجا تھا۔ اسی سال کی بات ہے کہ سلام بن مشکم یہودی کی بیوی زینب بنت الحارث نے آپ ﷺ کو کھانے پر مدعو کرکے زہریلا گوشت پیش کیا، لیکن گوشت کے ٹکڑے نے بروقت آپ ﷺ کو خبردار کردیا۔

آٹھویں سال کا نام سنۃ الفتح یعنی غلبہ وفتح کا سال منقول آتا ہے کہ اسی میں فتح مکہ وغزوۂ حنین پیش آئے تھے اور اسی سال سے اسلام کے حقیقی سیاسی غلبے کا آغاز ہوتا ہے۔ مابعدِ ہجرت نویں سال کو سنۃ البرائت یعنی برأت وعلیحدگی کا سال کہا گیا ہے کہ اسی سال سورہ توبہ وبرائت نازل ہوئی تھی جس میں کفار ومشرکین سے

صاف صاف اظہارِ برائت کیا گیا تھا اور سابقہ تمام معاہدوں کی تکمیل کے بعد انہیں جزیرۃ العرب سے انخلاء یا قبولِ اسلام کا الٹی میٹم سنایا گیا تھا۔ اس سال کو عام الوفو دیعنی نمائندہ وفدوں کا سال بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس سال میں جزیرۃ العرب کی ہر جہت سے عربی قبائل کے وفود نے کثرت کے ساتھ آ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا تھا۔ غزوۂ تبوک کے بارے میں مؤرخین متفق ہیں کہ وہ بھی اسی سال میں پیش آیا تھا۔ اس کے بعد ہجرت کے دسویں سال کو سنۃ الوداع کہا جاتا ہے کیونکہ اس سال آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کیا تھا اور عرفہ کے دن اپنا مشہور الوداعی خطبہ دیا تھا۔

سرکارِ رسالت ﷺ کے اس دنیا سے پردہ کر لینے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے امتِ اسلامیہ کی زمامِ خلافت سنبھالی۔ آپؓ نے اپنے عہدِ خلافت کا آغاز حضرت اسامہ بن زیدؓ بن حارثہ کے لشکر کو بھیج کر کیا۔ پھر آپ کے دور میں مرتدین سے جنگیں ہوئی اور اُن کی سرزنش کی گئی، نیز قرآنِ کریم کو بھی آپؓ ہی کے عہد میں جمع کر لیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے تقریباً ڈھائی سالہ دورِ خلافت کے بعد حضرت عمرؓ بن الخطاب خلیفۃ المسلمین منتخب ہوئے۔ آپؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں مختلف دیوانوں اور محکموں کو قائم کیا اور اسلامی افواج کو مستقل طور پر تیار کیا۔ آپ کے زریں عہد میں شام، عراق، مصر اور فارس کے ممالک میں حیران کن اسلامی فتوحات کا سلسلہ وقوع پذیر ہوا۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک خط لایا گیا جس میں شعبان کی تاریخ درج تھی۔ آپ نے لانے والے قاصد سے پوچھا کہ یہ کس سال کا شعبان ہے، جس پر وہ تحدید و تعیین نہ کر سکا۔ حضرت عمرؓ نے اس واقعہ کے بعد کافی غور وخوض کیا اور صحابۂ کرامؓ کو جمع کر کے مشورہ لیا۔ حاضرین میں سے بعض کی رائے تھی کہ اس سلسلے میں اہلِ فارس کا طریقۂ کار جان لینا بہتر ہوگا۔ چنانچہ فارسی سپہ سالار ہرمزان جو اس وقت مسلمانوں کی قید میں تھا بلایا گیا اور اُس سے اس بابت پوچھا گیا۔ اس کا جواب تھا کہ ہم اہلِ فارس اپنی تاریخ کو ماہ روز یعنی مہینوں کے حساب سے منضبط کرتے ہیں۔ اس کے بعد ماہ روز کی تعریب کی گئی اور تاریخ کا لفظ بنایا گیا۔ اب حضرت عمرؓ کا مطمحِ نظر تھا کہ امتِ مسلمہ کے لیے بھی ایک تقویم بنائی جائے جس کی بنیاد پر اسلامی حکومت تعامل کر سکے۔

دورانِ مشورہ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ رومی تقویم کو اختیار کر لیا جائے جب کہ دوسری رائے فارسی تقویم کو

اختیار کرنے کے حق میں تھی۔ حضرت عمرؓ کو دونوں رایوں سے اتفاق نہیں تھا۔ آپؓ نے مشورہ ملتوی کر کے اس بارے میں غور وخوض کرنا شروع کیا۔ اسی اثناء میں آپ کو حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کا ایک مکتوب موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ: ''ہمارے پاس آپ کے خطوط آتے ہیں جن میں کوئی تاریخ درج نہیں ہوتی، اس وجہ سے ہم نہیں جان پاتے کہ یہ کس وقت اور کن حالات میں تحریر دیے گئے ہیں۔ براہِ کرم آپ ہمارے لیے کوئی تاریخ متعین کر دیں جس سے ہم اپنے ایام واوقات میں تمیز کر سکیں۔'' حضرت عمرؓ نے اس خط کو پڑھا اور فرمایا: ''کیوں نہ ہم اللہ کے رسول ﷺ کی ہجرت کو اسلامی تاریخ کا افتتاح قرار دیں؟ ہجرت کا واقعہ سب کو معلوم ہے اور واضح بھی ہے اور اس میں کسی قسم کے شکوک وشبہات کا دخل بھی نہیں، نیز یہ واقعہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ سے بے حد مربوط ہے۔'' آپ کی اس رائے کو باتفاقِ مجلس قبول کر لیا گیا۔

آج جب ہم ہجرتِ نبوی کی یادیں تازہ کر رہے ہیں تو ذرا رک کر یہ جائزہ بھی لینا چاہیے کہ اس ہجرت سے پہلے اسلام اور اہلِ اسلام کی صورتِ حال کیا تھی اور اس ہجرت کے بعد کیا کچھ تغیرات وتبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ہجرتِ رسول ﷺ کے آگے پیچھے کی تاریخ کا تقابل کر کے شاید ہم زیادہ بہتر طور سے اس عظیم الشان واقعہ کی معنویت وافادیت سے آشنا ہو سکیں گے۔ اس تقابلی جائزہ کا آغاز اس بات سے کیا جائے کہ ہجرت سے پہلے اسلام کی دعوت وانتشار میں کس درجہ صعوبتیں ومشکلیں درپیش تھیں اور گروہِ مومنین کو کس درجہ کوشش وکاوش کرنا پڑتی تھی کہ اسلام کی دعوت لوگوں کے قلوب واذہان میں داخلہ پا جائے۔ ایک خوف ودہشت کا ماحول تھا جو قریش نے برپا کیا ہوا تھا، جہاں ہر طرف مظالم، تعذیب اور قتل وخونریزی کا بازار گرم تھا۔ لیکن ہجرت کے بعد اسلام اس تیزی سے پھیلا جیسے سورج کی شعائیں تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی پھیل جاتی ہیں۔ اب اسلام کا غلغلہ تھا اور اہلِ اسلام آزاد تھے کہ بلا کسی خوف وہراس کے اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں اور دنیائے انسانیت تک انھیں پہونچائیں۔

ہجرت سے پہلے کا اسلام عبارت ہے ایسے اصول ومبادی اور احکام وتعلیمات سے جو اپنے نفاذ کے منتظر تھے۔ اس وقت کوئی ایسا سماج تشکیل نہیں پا سکا تھا جو ان تعلیمات واحکام کو عملی وتطبیقی شکل دے۔ مکہ کے قریشی سماج پر جابرانہ وبت پرستانہ نظام غالب تھا جس میں کسی فردِ واحد کو اذن نہ تھا کہ وہ وثنیت زدہ رسوم ورواج سے سرِ مو انحراف کر سکے یا مروجہ احکام وفرامین کے علاوہ کسی اور تعلیم یا قانون پر عمل پیرا ہو سکے۔

اس وقت یہ حالت تھی کہ اسلام کو اپنے اہلِ خانہ، والدین، اور بھائی بہنوں تک سے چھپانا پڑتا تھا۔ اسلامی اجتماعیت مفقود تھی اور مسلمانوں کو کمزور تیسرے درجے کے افرادِ معاشرہ کی حیثیت سے زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ یارانہ تھا کہ وہ اپنے دینی شعائر وعبادات کو علی الاعلان قائم کرسکیں یا اپنے دین کو سیکھنے کے لیے کہیں اکٹھا ہوسکیں۔ بیشتر مسلمانوں کو اپنی نمازوں کی ادائیگی کے لیے مکہ کی تاریک گھاٹیوں کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ اس سماجی جبر واستبداد کے علی الرغم ان کے دل ایمان کے نور سے معمور تھے اور انہیں وجدان کی گہرائیوں سے یقین تھا کہ جلد ہی اللہ رب العزت ان کی نصرت وتائید کا سامان فرمائے گا۔

اب ہجرت کے بعد کی صورتِ حال کو دیکھیے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ اب ایک مسلمان نہ صرف اپنے اسلام کا اعلان کرتا ہے بلکہ اسلام ایک مایۂ فخر وناز چیز بن جاتا ہے۔ اب مسلمانوں کی جماعت ایک بڑا کنبہ ہے جو اسلامی زندگی پر عمل پیرا ہے۔ اب معاشرے میں اللہ کے گھر مساجد ہیں جہاں پنج وقتہ باجماعت کھلے طور سے اللہ کی کبریائی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ اب کسی کو دینی شعائر وعبادات کی ادائیگی سے روکا نہیں جاتا اور ہر انسان کامل آزادی اور امن واطمینان کے ساتھ اپنے رب کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ اب اہلِ اسلام کے لیے نصرت وتائید خداوندی نازل ہو چکی ہے۔

ہجرت سے پہلے اسلام کو مکہ کی چہار دیواری میں محصور کردیا گیا تھا اور کوشش کی جاتی تھی کہ اسلام کا نور کسی طور سے بھی دیگر علاقوں میں نہ پھیلنے پائے، بلکہ عملی صورتِ حال تو یہی تھی کہ اسلام مکہ میں بھی چند گھروں کے اندر محصور تھا۔ لیکن ہجرت کے بعد آفتابِ اسلام پوری تابانی کے ساتھ جلوہ افروز ہوا اور روئے زمین کا ہر حصہ بقدرِ ظرف واستطاعت اس کی روشنی سے مستنیر ہوگیا۔ اب اسلام کا آفاقی پیغام شہروں ملکوں کی علاقائی حدود اور مشرق ومغرب کی جغرافیائی تقسیم سے بلند ہو کر ساری دنیا کے لیے مشعلِ راہ بن گیا تھا۔

ہجرتِ رسول ﷺ کو ایک حتمی ضرورت بنانے اور جلد واقع کرنے میں اُس زمیں دوز سازش کا ہاتھ بھی ہے جو قریشی طاغوتوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو قتل کرنے کے لیے رچی تھی۔ اس سازش کا خلاصہ یہ تھا کہ قریشی خاندانوں میں سے ہر خاندان سے ایک تنومند وعالی نسب نوجوان کا انتخاب کیا جائے اور ایسے منتخب نوجوانوں کا مجموعہ بنا کر انھیں محمدؐ کا خون بہانے کے لیے ایک ساتھ حملہ کرنے کی تلقین کی جائے۔ اگر محمدؐ—نعوذ باللہ—اس طرح قتل کردیے جاتے ہیں تو ان کا خون قریش کے تمام خاندانوں میں بٹ جائے گا،

جس سے بنو ہاشم کے بس میں نہ ہوگا کہ وہ محمدؐ کے قاتلوں سے انتقام لے سکیں۔ ناچار انھیں دیت لینے پر مجبور ہونا پڑے گا جو برضا و رغبت ادا کر دی جائے گی۔ ایک طرف تو اساطینِ کفر، اسلام کو مٹانے کی یہ سازش کر رہے تھے، دوسری طرف مشیتِ ایزدی اسی سازش کے بطن سے اسلام کی سربلندی و اشاعت کا سامان کر رہی تھی۔

ہجرت کے بعد جیسے ہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ پہونچے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے مسجدِ نبوی کی تعمیر کا آغاز فرمایا اور اس موقع پر انصار و مہاجرین کے مجمعِ عام کو خطاب کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خطاب میں آپسی بھائی چارے اور باہمی تعاون پر زور دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا کہ کسی بھی مثالی معاشرے کے لیے اس کے افراد کے مابین رحمت و غمگساری اور احسان و ایثار کا جذبہ ہونا، نیز اپنے امام کی اطاعت و محبت کا پایا جانا بے حد ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطاب میں شرک اور کفر کی تمام اشکال و اعمال سے منع فرمایا اور آپسی بغض اور نقضِ عہد کی شناعت بیان فرمائی۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے مابین اسلامی مواخات قائم فرمائی اور کہا کہ: ''تم سب آپس میں دو دو بھائی ہو جاؤ۔'' انصاری صحابہؓ نے اس فرمانِ نبویؐ کی تعمیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے غریب الدیار بھائیوں کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اس اخوت کو حقیقی معنی میں روبہ عمل لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا۔ انصاری صحابہؓ کا اس موقع پر تعامل بے مثال تھا کہ انھوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کی دلجوئی کے لیے اور اخوتِ اسلامی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، اپنی ہر چیز زر، زمین، دکان سب کچھ آدھا آدھا دینے کی کوشش کی۔ بلکہ روایات میں آتا ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے ایمانی بھائی کے حق میں اپنا آدھا گھر اور دو بیویوں میں ایک سے دست کشی اختیار کرنے کی تجویز بھی رکھی تھی۔

انصار کی اس جود و سخا کے جواب میں مہاجرین صحابہؓ کا طرزِ عمل کامل خودداری و متانت کا تھا اور انھوں نے اپنے دینی بھائیوں پر بوجھ بننے کے بجائے خود کو ان کا ممد و معاون ثابت کیا۔ اس اخوتِ ایمانی کے نتیجے میں آئندہ فی سبیل اللہ جہاد کے لیے ایسی صفیں تیار ہوئیں جو سیسہ پلائی دیوار سے مشابہ تھیں۔ قافلۂ اسلام کی یہ پہلی کھیپ تھی جس نے اپنے اتحاد و اخوت کے ذریعہ وہ محیر العقول قربانیاں دیں اور ایسے معجزہ نما کارنامے انجام دیے جو اللہ پر توکل و اعتماد کے آخری درجہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ ہجرتِ مبارکہ سے ہمیں بہت سے نہایت درجہ اہم امور کی رہنمائی ملتی ہے جس کا سمجھنا اور یاد رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے کیونکہ اس کی روشنی میں جدید زمانے کے خطرناک چیلنجز کا مقابلہ کرنا آسان ہوگا۔ ہجرت سے ایک سبق یہ ملتا ہے کہ حق اپنے آپ میں ایسی ناقابلِ تسخیر قوت وطاقت ہے جو کسی حال میں مغلوب وشکست خوردہ نہیں ہوسکتا۔ غلبہ حق کا راستہ کتنا ہی دشوار گزار کیوں نہ ہو، لیکن اس میں منزل کا حصول یقینی ہے۔ اس کے برخلاف باطل کی سطوت وجبروت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، انجامِ کار اسے ایک دن نیست ونابود ہونا ہے۔

ہجرت ہمیں بتاتی ہے کہ ظلم وبربریت اور جبر واستبداد کسی درجہ کا بھی ہو، اگر ایمان کی حلاوت دلوں میں گھر کرگئی ہے، تو قوتِ ایمانی کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ ہجرت ہمیں سکھاتی ہے کہ ایسے وطنِ مادری کی کوئی قیمت نہیں جس میں انسان کی عزتِ نفس مجروح ہو، جہاں عقیدے کی آزادی سلب ہو، اور جہاں اپنے دین وایمان کے لیے امان نہ مل سکے۔ ہجرت بتاتی ہے کہ ایک مسلمان کا عقیدہ ہی اس کا وطن ہوتا ہے۔ ہر مسلمان — وطن، قوم اور رنگ کے اعتبارات سے قطعِ نظر — دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ کبھی اپنے بھائی کو بے یارومددگار نہیں چھوڑتا اور نہ کبھی اپنے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ظالموں کے رحم وکرم پر چھوڑتا ہے۔ ہجرت ہمیں اسلامی اخوت سکھاتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ ایمانی بھائی چارا مومن صفت انسانوں کا باہمی میثاق ہے اور ایک معاہدہ ہے جو بلند مرتبہ انسانی معاشرے کا ضامن ہے۔ ہجرت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی راہ میں آزمائشیں آتی ہیں، لیکن ان آزمائشوں کے نتیجے میں سچے اہلِ ایمان کے ارادوں کو مضبوطی وپختگی ملتی ہے اور حوصلوں کو قوت وپامردی۔ یہ آزمائشیں ان کے دلوں کو مایوسی وقنوطیت یا کمزوری وضعف میں مبتلا نہیں کرنے پاتیں۔ ہجرت سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ صبر واستقامت اور اتحاد ویکجہتی کے پہلو بہ پہلو، کتابِ الٰہی سے تمسک واعتصام پایا جائے تو معجزات رونما ہوتے ہیں اور دنیا میں کوئی ہدف ناممکن الحصول نہیں رہ جاتا ہے۔

یہ امور ہیں جن کی تاکید ہمیں ہجرتِ مبارکہ کے واقعہ سے ملتی ہے، لیکن کیا موجودہ دور کے طاغوتوں سے معرکہ آرائی میں ان امور سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ کیا ہمارے مابین اسلامی اخوت ویسی ہی پائی جاتی ہے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ چاہتے تھے؟ کیا ہمیں یاد ہے کہ ان تمام امور کا متحقق ہونا اللہ کی بنائی آفاقی

سنتوں اور قوانین کی مطابقت پر موقوف ہے؟ یہ تکوینی سنتیں کسی مخلوق کی رورعایت نہیں کرتیں اور ان میں تبدیلی کا بھی کوئی امکان نہیں ہے: سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلاً (احزاب:۲۶) ''یہ اللہ کی سنت ہے جو لوگوں کے معاملہ میں پہلے سے چلی آرہی ہے، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

کیا ہمیں معلوم ہے کہ ان کائناتی قوانین میں سے ایک بنیادی قانون یہ ہے: إِنَّ اللّهَ لاَ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُواْ مَا بِأَنْفُسِهِمْ وَإِذَا أَرَادَ اللّهُ بِقَوْمٍ سُوءاً فَلاَ مَرَدَّ لَهُ وَمَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَالٍ (رعد:۱۱) ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔ اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی، نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی ومددگار ہوسکتا ہے۔'' يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (محمد:۷) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔''

إِن يَنصُرْكُمُ اللّهُ فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ وَعَلَى اللّهِ فَلْيَتَوَكِّلِ الْمُؤْمِنُونَ (آل عمران:۱۶۰) ''اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔'' ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَى لَهُمْ (محمد، ۱۱) ''یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی وناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی وناصر کوئی نہیں۔'' وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (محمد، ۳۸) ''اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔'' وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَ أَخْبَارَكُمْ (محمد، ۱۳) ''ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تا کہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں۔''

وقت آ گیا ہے کہ ہم بحیثیتِ مجموعی اللہ تعالیٰ کی تکوینی سنتوں کو سمجھیں اور ان آفاقی قوانین کے مطابق اپنا طرزِ عمل سنواریں۔ ہمیں ہجرت کے تذکرے سے سبق لیتے ہوئے اپنی دنیا سدھارنی ہے اور اپنی آخرت بنانی

ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی سچی محبت کا تقاضا یہی ہے اور ہماری زندگی بھی ان کی پکار پر لبیک کہنے میں مضمر ہے۔

●⊟●

صفحہ ۲۷ کا بقیہ

_ ہمارا 'نظریہ' امن ہے اور اس 'نظریے' کے تحت ہم محبتوں کو پھیلانا چاہتے ہیں۔
_ جلسے میں ایک پرجوش 'نعرہ' لگایا گیا اور اس 'نعرے' کے بعد لوگوں میں جوش و خروش بڑھ گیا۔
_ ایک 'کوا' پیاسا تھا، اس 'کوے' نے پانی کی تلاش میں اڑنا شروع کیا۔

گیارہویں:

انگریزی الفاظ لکھتے ہوئے خیال رکھنا چاہیے کہ جو الفاظ یا اصطلاحات (ٹرمز) رائج ہو چکی ہیں، یا جن کا کوئی ترجمہ نہیں ہے یا ترجمہ ہے تو وہ عام طور پر استعمال نہیں ہوتا، اس لیے انہیں ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ انگریزی میں ہی لکھ دیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن انگریزی الفاظ کو اردو میں لکھا جائے گا، ان کی جمع اردو کی طرز پر بنائی جائے گی، نہ کہ انگریزی کی طرز پر، جیسے اسکول کی اسکولوں، کلاس کی کلاسوں، یونیورسٹی کی یونیورسٹیوں، اسٹاپ کی اسٹاپوں وغیرہ۔ تیسری بات یہ ہے کہ انگریزی کے بہت سے ایسے الفاظ جو 'ایس' سے شروع ہوتے ہیں، لیکن ان کے شروع میں 'الف' کی آواز ہوتی ہے، انہیں اردو میں لازمی طور پر الف کے ساتھ لکھا جائے گا۔ جیسے اسکول، اسٹاپ، اسٹاف، اسٹیشن، اسمال، اسٹائل، اسٹوری، اسٹار وغیرہ۔ لیکن ایسے الفاظ جو شروع تو 'ایس' سے ہوتے ہیں لیکن ان کے شروع میں الف کی آواز نہیں ہے انہیں الف سے نہیں لکھا جائے گا، جیسے سچیویشن، سورس، سینڈیکیٹ، سیمسٹر، سائن اور پسس وغیرہ۔

بارہویں:

ہندوستانی فلموں نے اردو پر جو بھدا اثر ڈالا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں لفظ 'اپنا' کی جگہ میرا بولا جاتا ہے۔ ہمیں اردو لکھتے ہوئے اسے ٹھیک کرنا چاہیے، اس لیے 'میں میرے نہیں' بلکہ 'میں اپنے لکھا جائے' جیسا کہ میں میرے گھر میں میرے بھائی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ بالکل غلط ہوگا، درست جملہ یوں ہوگا کہ میں اپنے گھر میں اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

●⊟●

آزادی کا اسلامی تصور

نعمان بدر فلاحی

آزادی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ، بنیادی حق اور ایک مقدس صورتحال کا نام ہے۔ اللہ نے بنی نوع انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے اُن میں ایک اہم نعمت آزادی ہے۔ خالق کائنات نے اپنی مخلوقات میں نباتات و جمادات کے برخلاف حیوانات کی فطرت اور سرشت میں حریت پسندی کو داخل کر رکھا ہے۔ چنانچہ اشرف المخلوقات حضرت انسان ابتدائے آفرینش سے ہی آزادی کے متوالے اور اس کے خواہاں رہے ہیں۔ قدرت نے انسان کو جو بے پناہ فطری قوتیں نیز اوصاف و خصوصیات عطا کی ہیں وہ صرف آزادی کی صورت میں بروئے کار آسکتی ہیں۔ آزاد فضا میں ذہن کے بند دریچے کھلتے ہیں اور انسان کی علمی، فکری اور تحقیقی سطح بہت بلند ہو جاتی ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں یہ حقیقت نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ جہاں انسان کو اپنی فطری آزادی کے ساتھ کام کے مواقع میسر آئے وہاں انسانیت کا چمن لہلہا اُٹھا۔ خوشحالی اور پرسکون زندگی کی عمارت بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ انسانیت کو عروج، اقبال اور ترقی کی معراج نصیب ہوئی۔

لیکن اس کے برخلاف غلامی میں فکر و نظر محدود، ذہن و دماغ کی قوتیں مفلوج اور ذہنی صلاحیتیں جمود و تعطل کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جب اور جہاں انسانوں کو غلام بنایا گیا وہاں زندگی کی خوشیاں آہوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہنستے مسکراتے اور شاداب چہروں پر نحوست، بے رونقی اور محرومیوں کی سیاہی چھا گئی۔ فطری صلاحیتوں نے دم توڑ دیا اور انتہائی قیمتی ہیرے جواہرات بے مول ٹھیکروں کے مانند یونہی زمین میں دفن ہو گئے۔

اسی نقطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا ع

بندگی میں گُھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

آزادی کا مفہوم

عربی زبان میں آزادی کو 'حریت' جبکہ انگریزی میں Freedom یا Liberty کہتے ہیں۔ فقہاء نے اس کی تعریف اِن الفاظ میں کی ہے ''حریت پورے ارادہ و اختیار کے ساتھ تصرف پر قدرت نیز آدمی کا غلامی کی قید

سے خالی ہونے کا نام ہے۔(معجم لغۃ الفقہاء)

آزادی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص یا ایک قوم خدا کی بندگی کرنے کے لیے آزاد ہو۔یعنی مخلوق سے آزاد ہوکر خالق کا غلام بن جانا ہی آزادی ہے۔انسانوں پر خود ساختہ انسانی قوانین کو بالجبر مسلط نہ کیا جائے۔ انسان سماج کی بے جا رسوم ورواج کا پابند اور اس کے بندھنوں میں جکڑا ہوا نہ ہو۔ہر انسان کو اپنی انفرادی، معاشرتی، مذہبی اور معاشی زندگی کا تحفظ حاصل ہو۔اسے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے اور حصول انصاف کا بھی پورا حق حاصل ہو۔

آزادی یا (Freedom) اس حالت وکیفیت کو کہتے ہیں جس میں انسان کو بنیادی حقوق مثلاً عقیدے اور مذہب پر عمل کا اختیار، عبادت گاہوں کی تعمیر اور ان کی مرمت کا اختیار، عزت وناموس کے تحفظ کا اختیار، مالکانہ حقوق و اختیارات، تنظیم سازی کا اختیار، تہوار اور جلسے جلوس کا اختیار، تعلیم گاہوں کے قیام کا اختیار، ریسرچ وتحقیق کا اختیار، تہذیب وشائستگی کے دائرے میں زبان وقلم نیز پریس اور میڈیا کے استعمال کا اختیار، اظہار رائے کا اختیار(جو دوسروں کی ایذا رسانی کا باعث نہ ہو) تنقید ومحاسبہ کا اختیار، کاروبار اور ملازمت کا اختیار، غذا اور خوراک کا اختیار، لباس اور پوشاک کا اختیار، تبدیلیٔ مذہب کا اختیار، اور تہذیبی تشخص کو برقرار رکھنے کا مکمل اختیار حاصل ہو۔

آزادی یہ ہے کہ کسی کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی انجام دہی سے روکا نہ جائے۔انسان کو اپنے معاملات میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کا اختیار ہو۔اپنے پسندیدہ نظریے، عقیدے اور فکر کو اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور ہر انسان کے پاس خود ارادیت کا حق (Right of Self Ditermination) ہو۔جس انسان کو خالق کائنات نے فکر وعمل کی آزادی کا اختیار دے کر دنیا میں بھیجا' اس کو غلام بنالینا دراصل خالق کائنات کی توہین اور اس کے فطری نظام کے خلاف بغاوت ہے۔

بدقسمتی سے مغرب میں آزادی کے تصور نے تمام حدود وقیود کو پار کرلیا ہے۔وہاں آزادی کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ انسان مذہب اور اخلاق سے بالکل آزاد ہوجائے۔آزادی کے نام پر بے حیائی اور عریانیت کو فروغ دیا گیا، سود وقمار کی اجازت دی گئی، شراب کی حوصلہ افزائی کی گئی اور جنسی تلذذ کی تمام امکانی صورتوں کو سند جواز دے دیا گیا۔یعنی انسان نے ایسی آزادی حاصل کی کہ وہ مذہب واخلاق کے تمام اصولوں، قدروں اور

قدیم سماجی روایات سے آزاد ہو کر نفس کا بدترین غلام بن گیا۔ آزادی کا بالکل بے قید ہو جانا بھی انسانیت کے لیے زبردست فساد اور مضرت کا سبب ہے۔

مغرب کا تصور آزادی

صدیوں پوپ اور کلیسا کے جبر و تشدد کے سائے میں گھٹ گھٹ کر جینے کے بعد جب ۱۸ ویں صدی عیسوی میں یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہوا تو ردعمل کے نتیجے میں آزادی کا ایک بے حیا، فحش، دوغلا، خودغرضانہ اور غیر فطری نظریہ پروان چڑھا جس نے مذہبی روایات اور انسانی اقدار کا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔ آج مغرب میں عورتوں کو برہنہ رہنے اور ہونے کی مکمل آزادی ہے مگر باحجاب طالبات کو کالج سے نکال دیا جاتا ہے اور عوامی مقامات پر پردے کے شرعی حکم پر عمل ایک جرم ہے۔ امریکہ جیسے مہذب، ترقی یافتہ، حقوق انسانی اور آزادی کے سب سے بڑے علم بردار ملک میں آج بھی سیاہ فام خود کو دوسرے درجے کا شہری سمجھتے ہیں اور اپنے حقوق کے لیے انجمنیں بنا کر باضابطہ جدو جہد کر رہے ہیں۔ اس کے بالمقابل ۱۴ سو سال قبل رسول اللہ ﷺ نے صرف یہ اعلان ہی نہیں کیا کہ ''کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنیاد پر'' بلکہ سیاہ فام بلال حبشی ص کو بیت اللہ اور مسجد نبوی کا مؤذن بنا کر اتنا اونچا مقام عطا فرمایا کہ حضرت عمرؓ انہیں سیدنا بلال کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

مغرب کی فحش آزادی نے معروف اخلاقی قدروں کا گویا خاتمہ ہی کر دیا ہے۔ متعدد ممالک میں ہم جنسی یعنی Homo Sexuality کو پارلیمنٹ میں بل پاس کر کے قانونی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بیٹا اپنی ماں کے ساتھ، بھائی بہن کے ساتھ اور انسان جانوروں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں حکومت برطانیہ نے ہم جنسی کے مسئلے پر غور و فکر کے لیے Wolfenaden Committee بنائی تھی جس نے اپنی رپورٹ میں لکھا: ''اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اچھی بات نہیں ہے بلکہ ایک برائی ہے، لیکن اس معاشرے میں جہاں ہر فرد کو آزادی دینے کا اعلان کیا گیا ہے' ہمارے پاس کوئی ایسی وجہ نہیں ہے جس کی بنا پر ہم اِس کی مخالفت کریں۔ ہمارے چارٹر میں یہ بات داخل ہے کہ ہم ہر انسان کو اس کی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی اجازت دیں، لہٰذا اس وجہ سے ہم اس کی تائید کرنے پر مجبور ہیں''۔

برطانیہ کے ڈاکٹر فریڈ مین کا خیال ملاحظہ فرمائیے: ''درحقیقت عقل کوئی چیز نہیں، اصل چیز خواہشات ہیں اور اس پر کوئی روک نہیں لگائی جاسکتی۔ اس دنیا میں اچھی اور بری چیزوں کا کوئی تصور نہیں۔ بس اچھی چیز وہ ہے جسے انسان کی خواہش تسلیم کرے اور بری چیز وہ ہے جسے انسان کی خواہش برا سمجھے''۔ (قانون معیشت اسلام کی روشنی میں، تقی عثمانی)

اظہار رائے کی آزادی (reedom of Expression) کے نام پر دنیا بھر کے ڈیڑھ بلین (۱۵۰ کروڑ) سے زیادہ مسلمانوں کے جذبات کو نظر انداز کر کے آج مغرب میں پیغمبر اسلام اور محسن انسانیت ا کی شان میں کارٹون اور فلم بنا کر اور مضامین لکھ کر گستاخیاں جائز سمجھی جاتی ہیں مگر ۱۰ ملین یہودیوں کے جذبات کی رعایت میں اسپین، آسٹریلیا، اسرائیل، جرمنی، بلجیم، ہنگری، رومانیہ اور فرانس وغیرہ میں ہولوکاسٹ کے خلاف بولنا، لکھنا، یا اس پر شبہ ظاہر کرنا قابل تعزیر جرم ہے۔ برطانیہ جیسے ملک میں حضرت عیسیٰ کی شان میں تو گستاخی جرم ہے مگر پیغمبر اسلام محمد عربی ا کے خلاف سلمان رشدی جیسے لوگوں کو دریدہ دہنی کی پوری اجازت ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی نے اسلام اور مغرب کی آزادی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ''وہ آزادیاں جن کا اسلام نہ صرف قائل بلکہ محافظ ہے' حقوق و مصالح کی آزادیاں ہیں، کفر و معصیت کی نہیں۔ یہ وہ آزادیاں نہیں ہیں جن کا اہل مغرب دم بھرتے ہیں اور جن کو شخصی آزادی یا پرائیویٹ لائف سے تعبیر کرتے ہیں کہ انسان شخصی طور پر مکمل آزاد ہے۔ چاہے زنا کرے، شراب پیئے یا کوئی اور گناہ کا کام کرے۔ اسلام اِس کفر و فسق کی آزادی کا قائل نہیں ہے، بلکہ اسلام حقوق و مصالح کی آزادی کا قائل ہے جیسا کہ میں نے اوپر واضح کیا۔ اسلام اس آزادی کا قائل نہیں ہے جس میں اپنا یا دوسروں کا نقصان پوشیدہ ہو یا جو آزادی تباہی و ہلاکت کی طرف لے جاتی ہو۔ آپ کی آزادیاں وہاں ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے دوسروں کا نقصان شروع ہوتا ہے۔ آپ کو سڑک پر کار چلانے کی مکمل آزادی حاصل ہے لیکن اس آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ایکسیڈنٹ کرتے پھریں۔ آپ کو ٹریفک کے قوانین کی پابندی ہر حالت میں کرنی ہے''۔
> (ترجمہ فتاویٰ یوسف القرضاوی، ص ۳۳۸)

اسلام فطرت کے خلاف ایسی مطلق آزادی کو تسلیم نہیں کرتا جو شتر بے مہار، مادر پدر آزاد اور کسی نظام و قانون کی پابند نہ ہو، بلکہ اسلام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اصول، ضابطے اور آداب و قوانین کی لگام

پہنا تا ہے تا کہ سماج میں بدامنی اور شر وفساد کو پھیلنے سے روکا جاسکے۔ پابندیوں کی زمین پر ہی آزادی کی کونپل پھوٹتی ہے۔شاید علامہ اقبالؒ نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا ۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گِل بھی ہے
انھی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے آزادی کے ضمن میں لکھا ہے کہ ''مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا مدعی ہے، اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد اس دائرے میں آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اُس کے رب نے اسے دیا ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اصول وقوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے، اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند سمجھتا ہی نہیں۔اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملے میں سب سے پہلے خدا اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اسی صورت میں آزادئ عمل برتتا ہے۔ اس کی آزادئ عمل اس حجت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملے میں شارع کا کوئی حکم نہ دینا اس کی طرف سے آزادئ عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے''۔(تفہیم القرآن، جلد اول، ص:۳۶۵)

حقیقی آزادی تو بلاشبہ اللہ واحد کی بندگی اور غلامی میں ہی حاصل ہوسکتی ہے۔انسانی آزادی کا ڈھول پیٹنے والے ادیان باطلہ ہوں یا جدید مادہ پرستانہ مغربی افکار ونظریات' سب کے سب انسانوں کا استحصال کر رہے ہیں اور انہیں متعدد مختلف النوع اشیاء اور لذت کام ودہن کا غلام بناتے چلے جارہے ہیں۔

عصر حاضر میں انسانی آزادی کی صورت حال

آج عالمی سطح پر اقوام متحدہ (United Nation) کے تحت آزادی اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے مختلف تنظیمیں اور ادارے سرگرم ہیں مگر حقیقی آزادی کی یہ جنس کم یاب ہے۔ بلند بانگ دعووں کے باوجود انسانیت حقیقی آزادی کے لیے ترس رہی ہے۔دنیا کے مختلف علاقوں اور ممالک میں کتنی ہی قومیں ہیں جو اِس ترقی یافتہ جدید دور میں بھی غلامی کے شکنجے میں کسی ہوئی ہیں۔متعدد ممالک، ریاستیں اور خطے جارح استعماری قوتوں کے خلاف سیاسی آزادی کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ایسے ملک بھی ہیں جو بظاہر سیاسی طور پر آزاد ہیں مگر اقتصادی، تہذیبی اور تمدنی غلامی کا شکار ہیں۔

ہندوستان جسے بلا شبہ اگست ۱۹۴۷ء میں بیش بہا قربانیوں اور جاں گسل جدوجہد کے بعد برطانوی استعمار کے پنجوں سے سیاسی آزادی حاصل ہوئی، مگر آج ۷۲ برس کے بعد بھی ہندوستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اکثریتی طبقے نے آزادی سے محروم کر رکھا ہے۔ عیسائیوں، دلتوں، سکھوں اور مسلمانوں پر اس عرصے میں جو کچھ گزری ہے اسے بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ سیکولر جمہوری اسٹیٹ میں جان و مال، عزت و آبرو، عبادت خانے اور تعلیم گاہوں کے تحفظ کو آج تک یقینی نہیں بنایا جاسکا۔ گورے آقاؤں کی جگہ سیاہ فام آریائی نسل کے برہمن حکمرانوں نے آزادی کے سبز باغ ضرور دکھائے مگر ہزاروں برسوں سے شودروں کو غلام بنا کر رکھنے ولوں کی ذہنیت اور فکر و نظر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ مختلف علاقوں میں چھوٹی ذات کا دولہا اپنی شادی کے موقع پر بھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوسکتا اس لیے کہ یہ حق تو صرف اعلیٰ ذات والوں کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی قیادت میں بدھ مت قبول کرنے والے لاکھوں انسان بہرحال آزادی اور انصاف سے محروم رہ گئے۔ طبقاتی نظام اور ورن ویوستھا کے ظلم و ستم کے نتیجے میں بدترین سماجی غلامی سے آزادی اور نجات تو صرف اسلام کے سایۂ رحمت میں ہی میسر آسکتی ہے۔

بھارت ہی نہیں، دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ اور انسانی حقوق کی صدائیں بلند کرنے والے ممالک میں خواہ امریکہ، روس اور چین ہوں یا عرب اور افریقہ کی مسلمان ریاستیں، انسانی آزادی کی صورتحال تقریباً یکساں ہے۔ وہ مسلم ممالک جہاں ملوکیت یا آمریت کا دور دورہ ہے، اگر انسانی حقوق سلب کرنے میں وہ کمیونسٹ ممالک سے آگے نہ ہوں تو غالباً پیچھے بھی نہیں ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں جاپان کے ۲ شہروں ہیروشیما اور ناگاسا کی پر ایٹم بم گرا کر اُن کی نسلوں کو تباہ کرنے والا امریکہ بہادر آج بھی عراق، شام اور افغانستان میں انسانوں کو غلام بنا کر اُن کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مغربی اقوام جو آج حقوق انسانی، حق آزادی اور جمہوریت کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئے ہیں، نصف صدی پہلے تک انہوں نے ہی نصف دنیا سے زیادہ حصہ کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور اب بھی دنیا کے بعض خطوں کو وہ اپنی نوآبادی بنائے ہوئے ہیں۔ ۳۰؍نومبر ۱۹۷۳ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسل پرستی کو قانونی جرم قرار دینے کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی تو چار ملکوں نے اس کی مخالفت کی اور حیرت کے کانوں سے سنیے کہ اُن چار ملکوں میں جنوبی افریقہ اور پرتگال کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ بھی تھے۔ یہ ہیں آزادی اور انسانی حقوق کے عالمی ٹھیکیدار!!!

یورپ کے مشہور مفکر روسو کا ۱۷۵۰ء میں کیا گیا یہ شکوہ ''انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن آج وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے'' صدیوں بعد آج بھی حرف بہ حرف درست معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے جب انسان شرک کی تاریک وادیوں میں بھٹکتا ہے تو اسے تہہ در تہہ غلامی کی زنجیریں جکڑ لیتی ہیں۔ وہ صرف خواہشات، آبائی رسوم و رواج اور سماجی روایات کا غلام نہیں ہوتا بلکہ اپنے جیسے انسانوں کو 'بھاگیہ وان' سمجھ کر اُن کی غلامی کا طوق بھی اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔ غلامی محض قید و بند کو نہیں کہتے کیونکہ یہ تو غلامی کی ایک سہل ترین قسم ہے جو دیر سویر جاتی رہتی ہے، غلامی تو دراصل اس عادت کی ہوتی ہے جو جڑ پکڑ لے یا اس لذت اور شہوت کی ہوتی ہے جو سر پر سوار ہو جائے اور جس سے کنارہ کشی ممکن نہ ہو۔ لہٰذا مطلوب اور حقیقی آزادی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی خواہشات اور منفی جذبات پر قابو رکھتا ہو اور کوئی عادت، رجحان اور تمنا اسے اپنا اسیر نہ بنا سکے۔

انسانی آزادی کا دشمن کون؟

☆ انسانی آزادی کا سب سے بڑا دشمن ہمارے اندر پوشیدہ ہمارا نفس ہے۔ انسان کا پیٹ، اس کی بھوک، جنسی خواہشات، عیش و آرام کی آرزو، معیار زندگی بلند کرنے کی تمنا جب حد اعتدال سے بڑھ جائے تو انسان غلامی سے قریب ہو جاتا ہے۔

☆ توحید کا انکار غلامی کا ایک اہم ترین بنیادی سبب ہے۔ جب انسان اپنے رب اور مالک حقیقی کی اطاعت و فرمانبرداری سے منہ موڑ کر اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کرتا ہے تو دنیا کی ہر شے اسے اپنا غلام بنا لیتی ہے۔ گویا شرک غلامی کی ایک اہم ترین وجہ ہے۔ جب انسان اپنے خالق کو چھوڑ کر جانوروں، کیڑے مکوڑں، پیڑ پودوں، سورج، چاند، ستاروں، آگ اور ہوا وغیر کی پوجا کرنے لگے تو وہ اپنی آزادی کو نیلام کر دیتا ہے۔ اللہ واحد کی غلامی کے سوا تمام قسم کی غلامیاں باطل ہیں۔ آزادی کے حصول، انسانی مجد و شرف کی بحالی نیز شرک و بت پرستی کے سبب پستی کے قعر مذلت میں ڈوبے ہوئے انسانوں کی نجات کے لیے اُن تمام غلامیوں کے خلاف منظم تحریک لازمی ہے۔ شاعر مشرق نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ع

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

☆ سرمایہ دارانہ نظام بھی انسانی آزادی کا بہت بڑا دشمن ہے۔IMFاور ورلڈ بینک وغیرہ کے ذریعہ عالمی طاغوت نے تیسری دنیا کے کروڑوں انسانوں کو اور ۱۰۰ سے زیادہ پسماندہ ممالک کو عملاً اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ دراصل ورلڈ بینک ایک یہودی ادارہ ہے جس کے ذریعہ یہود پوری دنیا کے معاشی نظام کو اپنی مٹھی میں رکھتے ہیں۔ اقتصادی طور پر بدحال ممالک کو خود آگے بڑھ کر قرضے فراہم کرتے ہیں اور مستقل سود وصول کرنے کے علاوہ اپنے پروگرام اور پالیسیاں زبردستی اُن پر تھوپتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انہیں بلیک میل کیا جاتا ہے۔

☆ مغرب کا فاسد استعماری فلسفہ جس نے ماضی قریب میں بیشتر ایشیائی ممالک کو طویل مدت تک باج گزار اور کالونی بنا رکھا تھا' انسانی آزادی کو سلب کرنے کا ایک بدترین ذریعہ ہے۔ اسی فلسفے کو اختیار کرکے درندگی کی علامت صہیونی مقتدرہ فلسطین میں گذشتہ ۷۵ برسوں سے انسانی آزادی کو بے دردی کے ساتھ مسخ کرنے میں مصروف ہے۔

☆ اقوام متحدہ (United Nation) کی سرپرستی میں ویٹو پاور کی حامل ۵ بڑی طاقتیں امریکہ، روس، چین برطانیہ اور فرانس وغیرہ دراصل عدل وانصاف، مساوات اور انسانی آزادی کی عملاً دشمن ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری دنیا اِن پانچ خداؤں کی جاگیر ہے (نعوذ باللہ)۔ ان کے جارحیت پسندانہ عزائم اور ظالمانہ اقدامات کے سبب دنیا بھر کے کمزور، غریب اور پس ماندہ ممالک اور بالخصوص امت مسلمہ ایک طویل عرصہ سے دہشت زدہ ہیں۔

☆ غیر منطقی آبائی رسوم ورواج، جاہلی سماجی روایات اور مذہبی اوہام وخرافات کی اندھی تقلید بھی انسانی آزادی کی دشمن ہے جس سے چھٹکارا صرف عوام الناس کے تعلیمی معیار کو بلند کرکے اور Scientific Aproach کے ذریعہ دلایا جاسکتا ہے۔

☆ دین بے زار سیاست اندھی، لنگڑی اور ہمیشہ سے ہی انسانی آزادی کی سخت ترین دشمن رہی ہے۔ تاریخ کے مستند واقعات گواہی دیتے ہیں کہ سیاست جب بھی الٰہی تعلیمات، علم واخلاق، مساوات اور تکریم انسانیت کے اصولوں سے بے زار ہوکر کبر وغرور، سفلی خواہشات اور مادی مفادات کی غلام ہوئی' انسانوں کی

آزادی سلب کرلی گئی۔ قرآن مجید میں فرعون کی جس سیاست کا متعدد مقامات پر تذکرہ ہے وہ اسی قبیل کی ہے۔ اقبالؒ نے اسی لیے کہا تھا۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

☆ جبری تسلط کے ذریعہ قائم ہونے والی خاندانی، فوجی یا آمرانہ حکومتیں بالعموم فطری آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کو بے دردی کے ساتھ پامال کرتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بحرین، مصر اور شام وغیرہ اس کی زندہ مثال ہیں جہاں حکمرانوں کی پالیسی اور پروگرام پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنا یا اسلام کو ایک نظام حیات کے طور پر پیش کرنا ایک سنگین جرم ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس جرم میں آپ جان سے بھی ہاتھ دھو سکتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ ردسمبر ۱۹۴۸ء کو انسانی حقوق سے متعلق جس عالمی منشور کا اعلان کیا تھا اس کی دفعہ ۱۹ آزادیٔ اظہار خیال کا حق دیتی ہے مگر اِن ممالک میں اِس بنیادی حق کا استعمال ممنوع، حرام اور ناجائز ہے۔

اسلام کا نظریۂ آزادی

بلا شبہ اسلام انسانی آزادی کا سب سے بڑا داعی اور علمبردار ہے۔ انسانی مجد و شرف کی بحالی اور بنیادی قدروں کے استحکام کا علمبردار قافلہ جس نے فی الحقیقت انسانی آزادی کے تحفظ کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے اور انسان کو حقیقی آزادی کا شعور بخشا' وہ انبیائے کرام کا قافلہ تھا۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم اور اس کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فرعون کے بھرے دربار میں دعوت حق کے ساتھ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا:

قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيٓ إِسْرَائِيلَ (اعراف:۱۰۵)

''میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی جانب سے واضح دلیل لے کر آیا ہوں، لہٰذا تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دو''۔

دوسرے مقام پر قرآن نے حضرت موسیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے:

أَنْ أَدُّوٓا إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ

’’اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کردو، میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں‘‘۔

(الدخان:۱۸)

قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی علاقے پر دشمن کے قبضے، اس کے ظلم وستم اور غلامی کی زندگی سے نجات و آزادی کے حصول کے لیے باضابطہ تیاری کے ساتھ لڑائی بھی کی جانی چاہیے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۴۶ تا ۲۵۱ میں مفسرین کے مطابق تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کے بعد فلسطین میں اُس وقت بنی اسرائیل کے بڑے علاقے پر اُن کے دشمن (عمالقہ) قابض ہو گئے تھے۔ حتیٰ کے ان کا قبلہ اور وہ صندوق جس میں موسیٰ اور آل ہارون کے تبرکات تھے وہ بھی ان کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ اُس وقت بنی اسرائیل میں حضرت سموئیل نبی کی حیثیت سے موجود تھے جو کافی بزرگ ہو چکے تھے۔ طالوت کی قیادت اور سربراہی میں دشمنوں سے لڑائی ہوئی جس میں حضرت داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ بالآخر اللہ کے اذن سے بنی اسرائیل نے دشمنوں کو مار بھگایا اور اس طرح بنی اسرائیل کو جالوت، اس کے لشکر اور عمالقہ سے آزادی نصیب ہوئی۔ قرآن مجید میں اہل ایمان سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

’آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اُس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دے‘‘۔ (النساء:۷۵)

معلوم یہ ہوا کہ دنیا کے کسی بھی خطے یا علاقے میں اگر مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو تختۂ مشق ستم بنایا جائے اور وہ غریب اپنے آپ کو ظلم وستم سے بچانے اور ہجرت پر قادر نہ ہوں تو انہیں اس ظلم سے بچانا اور ظالموں کے چنگل سے آزادی دلانے کے لیے دیگر مسلمانوں اور اُن کی حکومتوں کو آگے بڑھ کر اپنی استطاعت کے مطابق باضابطہ جہاد کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کا ایک معروف واقعہ ہے کہ جب سندھ کے راجہ داہر کے قید خانے سے ایک مسلمان خاتون نے اموی خلیفہ معتصم باللہ کو خط لکھ کر قید و بند کی اپنی المناک داستان سنائی تو ظالم گورنر حجاج بن یوسف کی غیرت وحمیت بھڑک اٹھی اور اس نے ۱۷ سالہ نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا جس نے بالآخر سندھ فتح کیا اور خواتین سمیت متعدد مسلمانوں کو ہندو راجہ کی قید سے آزادی دلائی۔

بدقسمتی سے آج اقوام متحدہ اور نیشنل ازم کے طاغوت نے درجنوں مسلمان ممالک اور عرب حکومتوں کو اس قدر بے دست و پابند دیا ہے کہ وہ فلسطین، برما، شام، اور سنکیانگ وغیرہ کے مظلوم مسلمانوں کی فطری آزادی کے لیے لڑائی تو دور کی بات ہے کوئی مؤثر سفارتی، مالی اور اخلاقی جدو جہد بھی نہیں کر پارہے ہیں۔ قرآن مجید کے اس واضح حکم کو اجتماعی طور پر پس پشت ڈال دینا اسلامی تاریخ کا ایک المناک حادثہ ہے۔

قافلۂ رسالت کے سالار اور گل سر سبد رحمت عالمؐ کی بعثت ایسے ماحول میں ہوئی جب پورا انسانی کنبہ اوہام و خرافات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور خود انسان اپنے جیسے انسانوں کی باضابطہ غلامی کا شکار تھے۔ عورتوں سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا جاتا تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں نبیؐ رحمتؐ انسانوں کو آزادی و حریت سے ہم کنار کرنے کے لیے تشریف لائے اور آتے ہی اعلان کر دیا کہ ''میں اس شخص کے خلاف مدعی اور وکیل استغاثہ ہوں گا جو آزاد انسانوں کو غلام بناتا ہے''۔ (صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حرا)

قرآن میں خاتم الانبیاء کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: **وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ** ۔(اعراف:۱۵۷)

''اور نبی ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے''۔

درحقیقت اسلام جسم کے ساتھ روح کی آزادی کا بھی داعی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں حقیقی آزادی یہ ہے کہ جسم کے ساتھ ساتھ انسان کی روح بھی اوہام و خرافات، باطل افکار و نظریات، غیر اللہ کی عظمت و بندگی اور کفر و شرک سے مکمل طور پر آزاد ہو۔ چنانچہ بنی نوع انسانیت کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے پہلی بار انسانی حقوق کا ایک عالمی منشور دنیا کے سامنے پیش کیا تھا:

''لوگو! بے شک تمہارا رب اور تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنیاد پر۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ جو خود کھاؤ وہی اپنے غلاموں کو بھی کھلاؤ، جو خود پہنو وہی اُن کو بھی پہناؤ۔ جاہلیت کے تمام خون باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون باطل کر دیتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں

اپنے خاندان (عباس بن عبدالمطلب) کا سود باطل کرتا ہوں۔عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرتے رہو۔جس طرح تمہارا حق عورتوں پر ہے اسی طرح عورتوں کا بھی تم پر حق ہے۔تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینے میں اور اس شہر میں حرام ہے''۔

عصر حاضر میں آج جہاں کہیں بھی اور دنیا کے جس فورم سے بھی حقوق انسانی کی بات ہوتی ہے اور Human Right کا چارٹر وجود میں آتا ہے وہ دراصل رسول اللہؐ کی تعلیمات اور احکامات و ہدایات کا پر تو نیز آپؐ کی دعوت کی صدائے بازگشت ہے۔

رسول اللہؐ کے زمانے میں انسانوں کو غلام بنا کر رکھنے کا عام رواج تھا۔اُن کی خرید فروخت ہوتی تھی اور اُن کے مالکانہ حقوق حاصل ہوتے تھے۔اسلام نے اسے ناپسند کیا اور اس کے خاتمے کی ترکیبیں بتائیں۔مختلف مواقع پر غلاموں کو آزاد کرنے کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے اور اس کی ترغیب دی گئی۔کفارے کے طور پر غلام آزاد کرنے کی مختلف صورتیں تجویز کی گئیں۔

سورہ توبہ کی آیت ۶۰ میں زکوٰۃ کے مصارف بیان کیے گئے تو اُن میں ایک مصرف ''فی الرقاب'' یعنی غلام کی آزادی کے لیے زکوٰۃ کی رقم کو استعمال کرنے کا حکم دیا گیا۔سورہ بلد میں ''فَكُّ رَقَبَةٍ'' یعنی غلام آزاد کرنے کو نیکی کا ایک اہم کام قرار دیا گیا۔اس سلسلے میں رسول اللہؐ سے متعدد احادیث مروی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچالے گا، ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں، شرم گاہ کے بدلے میں شرم گاہ''۔ (مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

حضرت علی بن حسینؒ (امام زین العابدین) نے اس حدیث کے راوی سعد بن مرجانہ سے پوچھا کیا تم نے ابوہریرہؓ سے یہ حدیث خود سنی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں۔اس پر امام زین العابدین نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بلایا اور اسی وقت اسے آزاد کر دیا۔مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کے لیے اُن کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔امام ابوحنیفہؒ اور امام شعبیؒ نے اسی آیت کی بنا پر کہا ہے کہ غلام آزاد کرنا صدقے سے افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صدقے پر مقدم رکھا ہے۔

بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے ہی مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قصداً روزہ توڑنے کا کفارہ ایک غلام آزاد کرنا ہے۔

عقیدۂ توحید دراصل انسانی آزادی کا مژدہ اور اِس بات کا اعلان ہے کہ اب انسان ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو کر صرف خدا کا بندہ بن کر رہے گا۔ اُس پر کسی مخلوق کی حاکمیت نہیں ہوگی۔ پھر شریعت اسلامی نے قدم قدم پر آزادی کے اس فطری جذبہ کا لحاظ رکھا۔ چاہے مسئلہ نکاح کا ہو یا خرید و فرخت اور مالی معاملات کا۔ اسلام کے سیاسی نظام کی تنفیذ پیشِ نظر ہو اور انتخاب امیر کی نوبت آئے، ہر جگہ حق آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلام کے اسی تصورِ آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک موقع پر خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق ص نے مصر کے گورنر عمر بن العاص ص اور ان کے بیٹے کو ایک معاملے میں زیادتی کے سبب طلب فرمایا اور عدل کا تقاضا پورا کرنے کے بعد تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا :

مَتیٰ اِسْتَعْبَدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهاتُهُمْ اَحْرَاراً

''لوگوں کو اُن کی ماؤں نے آزاد جنا تھا، تم نے کب سے اُن کو غلام بنالیا؟'' (اخبار عمرؓ، علی طنطاوی، ص ۱۸۴)

۵ نبوی میں ہجرت حبشہ کے موقع پر نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ نے جو خطاب کیا ہے اس کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ کی بعثت انسانوں کو ظلم و ستم، جہالت، اوہام و خرافات، رسوم و رواج اور شرک و بت پرستی سے آزادی اور نجات دلانے کے لیے ہوئی تھی۔ حضرت جعفرؓ نے فرمایا :

''اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، پڑوسیوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ اسی اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے۔ اُس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خوں ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں۔ چنانچہ ہم اُس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے۔ اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہوگئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں واپس چلے

جائیں‘‘۔(سیرت النبیؐ، حصہ اول، ص۱۶۹)

۱۵ ہجری میں حضرت عمر فاروقؓ کا عہد خلافت تھا، جنگ قادسیہ سے قبل مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان سفارتی کوششیں جاری تھیں۔ اسی دوران حضرت ربعی بن عامر ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں مسلمانوں کے سفیر بن کر گئے اور اس سے واضح اور دوٹوک انداز میں فرمایا ’’اللہ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لائیں‘‘ :

’’اِبْتَعَثَناَ اللّٰهُ لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبادِ اِلیٰ عِبادَةِ اللّٰهِ وَحدَهُ وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْياَ اِلیٰ سَعَتِها وَمِنْ جَورِ الْاَدْيانِ اِلیٰ عَدلِ الاِسْلاَمِ

‘‘۔(ابن کثیرؒ۔البدایہ والنہایہ، جزء السابع، ص۴۰-۳۹)

’’اللہ نے ہمیں بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ واحد کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر اس کی وسعتوں میں داخل کریں اور مذہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے عدل کے سائے تلے لے آئیں‘‘۔

عہد فاروقی ہی میں مکہ کے گورنر حضرت نافع بن حارث مدینہ تشریف لے گئے تو اپنے آزاد کردہ غلام ابن امیری صکو مکہ میں اپنا نائب بنا کر آئے۔ حضرت عمرؓ نے جب ان کی صفات سنیں تو بے انتہا خوش ہوئے۔

اسلام آزادی کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی تفریق نہیں برتتا۔ چنانچہ فقہاء نے اس سلسلے میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ ’’لَهُمْ مالنا و علیهِمْ ما عَلینا‘‘ اُن کے (یعنی ذمیوں کے) بھی وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں اور ان کی بھی وہی ذمہ داری ہے جو ہماری ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے مسلم ریاست کے غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے متعلق فرمایا: مَنْ قَتَلَ مُعاهِداً لَمْ يَرِحْ رائِحَةَ الْجَنةِ ’جس نے کسی ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو تک نہیں سونگھ سکے گا‘‘۔(بخاری، کتاب الدیات)

اسلام کی عطا کردہ اِس ہمہ گیر اور بے نظیر آزادی کی فیوض و برکات سے دنیا اسی وقت مستفید اور متمتع ہو سکتی ہے جب مسلمان ہی نہیں اسلام بھی سیاسی طور پر کسی خطے میں آزاد ہو۔ کاش ہماری آنکھیں جیتے جی اسلام کی سیاسی آزادی کا سورج طلوع ہوتے دیکھ پاتیں۔

تحفظ شریعت — تحفظ حیات

نورالصباح فلاحی

اسلام اپنی تہذیب، اپنے مشن و پیغام میں ایک عالمگیر و آفاقی مذہب ہے، اس کی تعلیمات میں بلا کی کشش وجاذبیت ہے، اور فطرتاً انسان دوست اور عین فطرت انسانی کے مطابق ہے جو دلوں میں جگہ اور انسانی قلوب پر فتح حاصل کرتی ہے، اور ایک انقلاب برپا کر دیتی ہے اور ایک ایسی تہذیب وتمدن کی بنیاد ڈالتی ہے جس کے سایہ میں انسانیت سکون پاتی ہے اور جو تہذیب جتنی زیادہ اپنے اصولوں میں حقیقت ہوتی ہے وہ تاریخ میں جاودانی ولافانی کا مقام حاصل کرتی ہے۔ اسلام اپنے اصول اور اپنے اعلیٰ اقدار اور تصور حیات کی وجہ سے جاودانی کا مقام رکھتا ہے، دشمن اسلام کو اس سے خطرہ ہے، وہ اسی بات سے خوف زدہ ہیں، انھیں اسلام کی پر امن تعلیمات سے خطرہ ہے، اذان کے پیارے بول اور الفاظ سے نفرت ہے، مسلمانوں کے ذبیحۂ حلال سے شاکی ہیں اور ان کے عائلی قوانین وخاندانی نظام سے ڈر رہے۔

ایک مشہور نومسلم دانشور مراد ولفریڈ ہوفمین اپنی فکر انگیز کتاب ”Religion On The Rise: Islam In The Third Millennium“ میں تفصیل سے لکھتے ہیں کہ خاندانی نظام اور خاندانی قدریں اسلام کی بہت بڑی طاقت وقوت ہیں اور مستقبل میں یہ مغربی دنیا میں اسلام کے لیے کشش پیدا کریں گی“۔

آج پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں پر چہار جانب سے حملے ہو رہے ہیں اور خاص طور پر ہمارے ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کو گم کرنے کا ایک سلسلہ جاری ہے، گیان واپی مسجد، مسئلہ قطب مینار کو وشنو استمبھ ثابت کرنا، نصاب تعلیم کو بدلنے کا مطالبہ، کرناٹک میں مسئلۂ حجاب یہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

حجاب پر پابندی کا یہ اعلان نیا نہیں ہے، سب سے پہلے اسکارف پابندی کا قانون فرانس میں جاری ہوا۔ ”ستمبر عالمی یوم حجاب“ اسی حجاب پر پابندی کے ردعمل کے طور پر ہے جو پوری دنیا میں منایا جاتا ہے۔ ہالینڈ میں بھی حجاب پر پابندی کا اعلان کر دیا گیا کہ آئندہ سال سے برقع، نقاب، حجاب یا ایسے ملبوسات جن سے چہرہ نظر نہ آئے کے لینے پر پابندی ہوگی۔ فرانس میں تو پہلے سے ہی حجاب پر پابندی تھی، وہاں عوامی مقامات

پر چہرے پر نقاب اوڑھنے والی کسی بھی مسلم خاتون کو مالی جرمانہ اور قید کی سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حجاب کی مخالفت کیوں؟

حجاب پر پابندی اسلام دشمنی اور مسلمانوں کی تہذیبی شناخت کو مٹانے کی سازش ہے کہ مسلمان اپنی شریعت اور اپنے اسلامی قوانین سے دست بردار ہو جائیں، دوسری طرف مغربی دنیا پردے کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہے، عیش وعشرت، لطف ولذت اور تن آسانی وعیاشی ہی اس کے لیے سب کچھ ہے۔ اس لیے اس کا نظریہ ہے کہ دولت کے حصول کے لیے مرد وعورت دونوں کام کریں۔ مرد وعورت ہونے کی بنا پر ان کے دائرۂ کار میں کوئی تقسیم نہیں ہونی چاہیے۔

اس نظریہ کی بنیاد پر صنفی رول کا انکار کیا گیا، یعنی عورت ہر وہ کام کرسکتی ہے جو مرد کرسکتا ہے، یہ نظریہ عورت کی نسوانی شخصیت اور نسوانی رول کا استخفاف کرتا ہے، ان کے نزدیک جہاز میں مسافروں کی خدمت اور استقبالیہ پر مہمانوں کی دلجوئی قابل احترام مصروفیت ہے۔ لیکن نئی نسل کی تعلیم وتربیت اور خاندان جیسے اہم ادارے کا انتظام وانصرام حقیر کام ہے۔ مغرب کے نزدیک اخلاق وکردار، پاکدامنی کا معیار یہ ہے کہ کھلی فضا میں مرد وعورت کام کریں اور اپنی جنسی تعلقات جس سے چاہیں قائم کرلیں کوئی گناہ یا جرم نہیں ہے، بس رضامندی شرط ہے۔

مغرب کا یہ تصور امپاورمنٹ خواتین کے نسائی کردار کو کم تر قرار دیتا ہے اور مرد وعورت کے درمیان غیر فطری کشمکش کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ آزادی کے باجود ان کے یہاں گھر کا سکون غارت ہے۔ خاندانی ادارہ تباہ وبرباد ہو رہا ہے۔ جب کہ اسلام بھی خواتین کو بااختیار بننے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ لیکن اسے جو اختیارات وحقوق دیتا ہے، اس کے نسائی کردار اور اس کے رول کو بھی عزت دیتا ہے اور محبت وتعاون کی فضا میں عورت کو Empowered کرتا ہے۔ اس کی فطری صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی عفت وآبرو کی حفاظت کرتے ہوئے کہیں بھی اسے بااختیار ہونے سے نہیں روکتا۔ اسلام ایک معتدل نظام زندگی ہے جس میں مرد وعورت ایک دوسرے کے رفیق ہیں، حریف نہیں، ایک دوسرے کے لیے سکون وراحت ہیں۔ اسلام نے خواتین کو اپنے مال پر پورا اختیار دیا۔ تعلیم وتبلیغ اور اپنی صلاحیت کیا ستعمال میں کہیں بھی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ لیکن اس کے نزدیک عورت کا امپاورمنٹ یہ نہیں کہ وہ مرد بن جائیں، بلکہ عورت کو اس

کے مقام پر رکھ کر اسے اپنی صلاحیت کے استعمال کی پوری آزادی دی۔

دورحاضر میں معاشی جدو جہد کی اجازت کو فریضہ کی حیثیت دے دی گئی جس کی وجہ سے گھر کا سکون درہم برہم ہوگیا اور عائلی و ازدواجی رشتے میں کمزوری آنے لگی۔ حقوق وفرائض کی تقسیم بے معنیٰ ہو کر رہ گئی، ہر کوئی مالک ومختار، خود کفیل ہوگیا۔ اور ایک دوسرے سے بے نیاز ہوگیا۔

ضرورت ہے کہ اسلام کی راہ اعتدال کو سمجھا جائے آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے''المرأة راعية.۔ الحدیث (، بخاری ومسلم)۔ یہ حدیث عورت کے دائرۂ کار کو متعین کرتی ہے اور اس کو حقیقی معنیٰ میں بااختیار بناتی ہے۔ تاہم اسے حوائج ضروریہ کے لیے باہر نکلنے کی پوری اجازت دیتی ہے۔

پردہ کی شرعی حیثیت

عورت کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ''عورت ساری کی ساری پردہ وستر ہے، جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اسے جھانکتا ہے (سنن ترمذی حدیث ۱۱۷۳) علامہ البانی نے صحیح ترمذی حدیث ۹۳۶ میں اسے صحیح کہا ہے۔

سورۃالاحزاب آیت ۵۹ "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاء الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ میں حجاب و پردے کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ یہ آیت باہر نکلنے کے وقت عورت کے باپردہ ہونے کی دلیل ہے۔ زیادہ تر فقہائے عظام اور مفسرین امت نے اس کا یہی مفہوم لیا ہے کہ عورت جب باہر نکلتی ہے تو کسی چادر یا کپڑے سے اپنے چہرے سمیت اپنے پورے جسم کو چھپالے تاکہ وہ غیر محرم کی نگاہوں سے محفوظ رہیں۔ یہ حجاب کا وہ درجہ ہے جسے ازواج مطہرات نے خارج البیوت لباس کا جزء بنایا تھا، یہ وہی نقاب پردہ گھونگھٹ ہے جو حجاب کے نام سے مشہور ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعاً فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاء حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ

''نبی ﷺ کی بیویوں سے فرمایا جب تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے مناسب طریقہ ہے۔''

گرچہ اس آیت کو مفسرین ازواج نبی کے لیے خاص کرتے ہیں۔ لیکن ازواج نبی ﷺ جو تقویٰ وخدا ترسی میں اولیت کا مقام رکھتی ہیں اور تمام اہل ایمان کی مائیں ہیں پھر بھی ان کو یہ حکم چہرہ کے پردہ پر دلیل ہے۔

آج سر کے اسکارف کو حجاب کہنا شروع کر دیا گیا اور سر کے حجاب کو ایک مسئلہ بنا دیا گیا۔ حالاں کے سر کے حجاب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سر کو ڈھانپنا حکم شریعت ہے، البتہ چہرہ ڈھانکنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو اس کے ڈھانپنے پر سب کا اتفاق ہے، متعدد علمائے سلف نے صاف لکھا ہے کہ امت کا اس پر اجماع ہے کہ چہرہ اور دونوں ہاتھوں کے سوا عورت کا پورا جسم مستور ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حجاب شریعت کا حکم ہے۔ چہرہ کا پردہ گرچہ مختلف فیہ ہے مگر مفسرین کی زیادہ تر تفاسیر و آراء پردہ کے حق میں ہے۔ علامہ آلوسیؒ جلباب کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

الجلباب، جمع جلابیب، وھو ماروی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ الذی یستر من فوق الی اسفل (روح المعانی، جلد ۱۱، ص ۲۶۴، ط: دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔ یعنی جلباب وہ چادر ہے جو جسم کو اوپر سے نیچے تک چھپالے‘‘

امام ابن حزم رقم طراز ہیں ’الجلباب فی أمة العرب خاطبنا بها رسول الله ﷺ فھو ما غطیٰ جمیع الجسم لا بعضہ‘‘ اس سے بھی چہرہ کا پردہ ثابت ہے اور سر کا تو ہے ہی۔ رئیس المفسرین حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق اجنبی کے سامنے عورت پر چہرہ کا پردہ لازم ہے۔ امام محمد بن سیرینؒ نے حضرت عبیدہ بن سفیان الحارث الحضرمی سے دریافت کیا کہ اس پر عمل کا کیا طریقہ ہے تو انھوں نے چادر اوڑھ کر بتایا اور اپنی پیشانی اور آنکھ کو چھپا کر ایک آنکھ کھلا رکھا۔

ان تفاسیر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عورت باہر نکلتے وقت ایسے لباس یا چادر کا استعمال کرے جو اس کے پورے وجود کو چہرہ سمیت ڈھانپ لے۔

ائمہ اربعہ میں امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے تو چہرہ و ہتھیلیاں کھولنے کی مطلقاً اجازت نہیں دی ہے، خواہ فتنے کا خوف ہو یا نہ ہو، البتہ امام اعظمؒ نے فرمایا کہ اگر فتنہ کا خوف ہو تو کھولنا منع ہے، لیکن اس زمانہ میں خوف فتنہ نہ ہونے کا احتمال شاذ و نادر ہے اور نادر معدوم کے حکم میں ہوتا ہے۔ اس لیے متأخرین فقہائے احناف نے وہی فتویٰ دیا ہے جو ائمۂ ثلاثہ نے دیا ہے کہ ان عورتوں کا چہرہ اور ہتھیلیوں کا کھولنا ناجائز اور اور پردہ کرنا ضروری ہے۔ مولانا ادریس کاندھلویؒ نے ’’وقرن فی بیوتکن‘‘ کے تحت لکھا ہے کہ

''عورت کو اپنی زینت ظاہرہ صرف محارم کے سامنے کھلا رکھنے کی اجازت ہے، نامحرموں کے سامنے کھولنے کی اجازت نہیں ہے کہ وہ سر بازار چہرہ کھول کر حسن و جمال دکھلاتی پھریں، حسن و جمال کا تمام دراومدار چہرہ پر ہے۔ اصل فریفتگی چہرے پر ہی ختم ہوتی ہے۔ اس لیے شریعت مطہرہ نے زنا کا دروازہ بند کرنے کے لیے نامحرم کے سامنے چہرہ کھولنا حرام قرار دیا ہے(معارف القرآن، کاندھلوی۔)

ایک طرف چہرہ کے حق میں یہ تفاسیر ہیں۔ وہیں دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ چہرہ کا پردہ نہیں ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ چہرے کے پردے کے سلسلے میں لفظاً کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایام حج میں حالت احرام میں چہرہ کھلا رکھنے کا حکم ہے۔ جب کہ روایت یہ ہے کہ حالت احرام میں بھی ازواج مطہرات اور عام خواتین اسلام نقاب کے بغیر بھی اپنے چہروں کو چھپاتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے اس وقت چہرہ کو ڈھانپنے کا رواج عام تھا اور یہ بات بھی کہ آپ ﷺ نے شادی کے لیے منگیتر کو دیکھنے کی اجازت دی تھی۔ اس سے بھی چہرہ کا پردہ ثابت ہوتا ہے۔ ورنہ اجازت کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔

ان سب کے باوجود ازواج مطہرات کا جنگوں میں شرکت، اورزخموں کی مرہم پٹی کی روایت تاریخ میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں چہرہ کو مستقل ڈھانپے رہنے میں مشکلات ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ اسلام میں ناگزیر حالات وضروریات کے لیے چہرہ کھولنے کی اجازت ہے۔ اسلام کا قانون ایک غیر معتدل اور یک طرفہ نہیں ہے، بلکہ غایت درجہ متناسب ومتوازن ومعتدل ہے۔ ایک طرف اخلاقی فتنوں کا سد باب کرتا ہے تو دوسری طرف حقیقی ضروریات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس نے عورت کے لیے چہرہ اور ہاتھ کے باب میں قطعی احکام ایسے نہیں دیے ہیں کہ جیسے ستر پوشی اور اخفائے زینت کے بارے میں دیے ہیں۔

پردہ کے سلسلہ میں اسلام نے جو تعلیمات دی ہیں اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ شریعت خواتین سے کس طرح کا پردہ چاہتی ہے اور کیسے مستور رکھنا چاہتی ہے۔ سورۂ نور واحزاب کی آیتوں پر غور کریں تو پردہ کے باب میں پورا ایک نظام نظر آتا ہے۔

- گھروں میں داخل ہونے کے لیے مردوں کو استیذان کی ہدایت
- اپنی چھوٹی اولاد اور غلاموں تک کو مخصوص اوقات میں اجازت لینے کی تعلیم

- غیر محرم رشتہ داروں کے لیے غض بصر کا حکم
- اظہار زینت کے لیے محرم وغیر محرم کی تعیین
- گھر سے باہر نکلنے کے لیے جلباب کا استعمال

احادیث سے مزید وضاحت ہوتی ہے کہ گھر کے اندر عورت کو کیسے پردہ کرنا ہے۔ بہنوئی، دیور، جیٹھ کے لیے کیا حکم ہے۔ چچا زاد، ماموں زاد، اور خالہ زاد رشتوں کے سلسلہ میں عورت کو کیا احتیاط برتنی ہے۔ یہ تعلیمات اسلام میں عورت باپردہ ہونے پر دلیل ہے۔

- جو شریعت گھر کے اندر باپ، بھائی، اور محرم رشتہ داروں کے سامنے ہاتھ و چہرے کے سوا حصہ جسم کے کھولنے کی اجازت نہیں دیتی اور اپنے ہی رشتہ دار غیر محرم کے سامنے اظہار زینت سے روکتی ہے تو پھر وہ کیسے اس بات کی اجازت دے سکتی ہے کہ عورت باہر بغیر پردے کے نکلے اور جوان عورت کے میک اپ کیے ہوئے چہرہ اور مہندیوں و چوڑیوں سے پُر ہاتھوں پر غیروں کی نگاہ پڑے، جب کہ فتنہ اپنی پوری سرو سامانی کے ساتھ موجود ہو۔ غور کریں تو یہ حقیقت صاف سمجھ میں آتی ہے کہ عورتوں کو کھلے چہرے کے ساتھ باہر پھرنے کی اجازت دینا ان مقاصد کے خلاف ہے جو خواتین کی عزت و آبرو کے تحفظ کے پیش نظر ہے۔

مولانا مودودیؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ احوال کے لحاظ سے شدت اور گنجائش ہے۔ عورتوں کے لیے عام قاعدہ یہی ہے کہ چہرہ پر گھونگھٹ یا نقاب ڈالے رہیں اور اس عام قاعدہ میں ''الا ماظھر منھا'' کے استثناء سے یہ آسانی پیدا کردی گئی ہے اگر واقعی چہرہ کھولنے کی ضرورت ہو تو کھول سکتی ہے بشرطیکہ نمائش حسن مقصود نہ ہو، بلکہ دفع حاجت مدنظر ہو۔

- آیت میں ''غیر أولی الإربة من الرجال'' کی قید یہ بتاتی ہے کہ اصل مقصود مردوں کی شہوت رانی سے بچنا ہے۔
- ایک طرف حجاب کے یہ احکام ہیں تو دوسری طرف خواتین امت کی بے حجابی بہت سے مسلم گھرانے میں سرایت کر گئی ہے، ان کے یہاں حجاب و نقاب کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ محرم اور غیر محرم میں کوئی تخصیص نہیں ہے، تقریبات اور دوسری محفلوں میں حجاب تو دور کی بات ستر پوشی تک کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ ہماری خواتین کے غیر ساتر لباس بے حجابی و عریانیت کو بڑھاوا دیتی ہے جس کے نتیجہ میں بے حیائی و زنا تک

وتقویت مل رہی ہے اور بہت سی دیگر برائیاں پنپ رہی ہیں۔

ایک طرف بیرونی حملے تو دوسری طرف ہماری اپنی قانونی شریعت سے انحراف۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ پابندی حجاب اللہ کے غضب کا مظہر ہو کیوں کہ جب کوئی قوم اللہ کے قانون سے انکار وانحراف کی روش اپناتی ہے تو اللہ کی سنت اس پر جاری ہوجاتی ہے کہ وہ اس سے اپنی نعمت چھین لیتا ہے جس کی وہ ناقدری کرتا ہے' ان الله لا يغير ما بقوم حتىٰ يغيروا ما بأنفسهم۔ اللہ کے قانون کی صریح خلاف ورزی اس کے غضب وغصہ کو دعوت دیتی ہے۔ فاعتبروا یا أولی الأبصار..

غرض یہ کہ حجاب اللہ کا حکم ہے، اسلام کا شعار ہے، مسلمان عورت کی پہچان ہے، اس کا وقار وتحفظ ہے، اس کی عزت وتقدس ہے، معاشرتی امن کا ذریعہ ہے، عورت کی حیا اور اسلامی تہذیب ہے۔ شیطانی چالوں اور اس کی درانداز یوں سے بچنے کے لیے ایک مضبوط قلعہ ہے۔ پس بہنیں اور بیٹیاں اس کی حفاظت کریں، اس میں ان کے لیے زندگی ہے، اپنی شریعت کی حفاظت اور اس پر عمل آوری نہ صرف یہ کہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے بلکہ اس کے ذریعہ ہم اپنی شناخت و پہچان اور اپنے وجود کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اپنی شریعت کی حفاظت کر سکتے ہیں اور بحیثیت مسلم اپنی اسلامی تہذیب کو زندہ وجاوید کر سکتے ہیں:

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف

يأيها الذين آمنوا استجيبوا لله وللرسول إذا دعاكم لما يحييكم۔ اے مومنو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو، کیوں کہ اس میں تمہارے لیے زندگی ہے۔

بدلتا ہوا عالمی منظر نامہ اور امت مسلمہ کا مطلوبہ کردار

ڈاکٹر محمد ارشد فلاحی

موجودہ دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے، اتنی تیز رفتاری کے ساتھ کہ شاید پچھلے زمانے کے لوگوں نے اس کا تصور بھی نہ کیا ہو۔ تبدیلی کا یہ عمل اس قدر تیز اور ہمہ گیر ہے کہ خواہش کے باوجود نہ اس پر کوئی پابندی عائد کی جاسکتی ہے اور نہ ہی کوئی خود کو یا کسی کو اس تبدیلی کے عمل سے گزرنے سے روک سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس برق رفتار تبدیلی کے اثرات بھی اسی پیمانے پر پوری دنیا میں محسوس کیے جاتے ہیں اور دنیا کا کوئی بھی خطہ یا علاقہ اس سے مس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عالمی منظر نامے پر رونما ہونے والی اس تیز رفتار تبدیلی کا موجودہ زمانے میں سب سے بڑا مظہر گلوبلائزیشن ہے۔

گلوبلائزیشن بنیادی طور پر ابلاغ کی سہولتوں کا مرہون منت ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ ابلاغ کی سہولتوں کے عموم نے نہ صرف یہ کہ Conectivity (ارتباط) کو بے انتہا آسان کردیا ہے بلکہ اس کے سبب سرحدی حد بندیاں بھی بے معنی ہوتی جارہی ہیں۔ گلوبلائزیشن کی حالیہ تحریک نے اثر پذیری اور اثر اندازی کے عمل کو اس قدر تیزی اور وسعت عطا کردی ہے کہ چپہ چپہ اس کے سحر میں ہے۔ یہاں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ گلوبلائزیشن کو محض ایک ظاہرہ کہہ کر یا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک تحریک ہے جس کی جڑیں موجودہ مغرب میں ہیں اور جو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مغرب کی بالادستی کو نہ صرف قائم و برقرار رکھنے بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ طول دینے کے مقصد سے جاری ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان بحیثیت امت موجودہ عالمی نظام کا ناگزیر حصہ ہیں۔ دنیا کے تقریباً سبھی خطوں اور ملکوں میں مسلمان رہتے اور بستے ہیں۔ خطہ ارضی کا ایک بہت بڑا رقبہ مسلمانوں کے زیر تسلط ہے، قدرتی وسائل اور افرادی قوت بھی مسلمانوں کے پاس وافر مقدار میں موجود ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو نظر انداز کر کے نظام عالم جاری نہیں رہ سکتا۔ اس لیے بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے میں مسلمانوں کا بحیثیت امت کردار کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے اس پر بھی بحث و گفتگو ہونی ضروری ہے۔ چوں کہ ہندوستانی مسلمان بھی عالمی امت اسلامیہ میں شامل ہیں اور سماجی و دیگر تغیرات خواہ وہ عالمی سطح پر ہوں یا مقامی طور پر واقع ہو رہے

ہوں، وہ بھی ان تغیرات سے متاثر ہوتے ہیں، اس لیے بحیثیت ہندوستانی مسلمان بھی ان کا کردار متعین ہونا چاہیے۔

گلوبلائزیشن کی تحریک کثیر الجہات ہے اور اس نے عالمی منظرنامے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ گلوبلائزیشن کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں کسی ایک یا چند پہلوؤں تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق معیشت، سیاست، ثقافت، مواصلات اور رسل و رسائل سبھی سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ماہرین اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق اس کی تشریح و توضیح کرتے ہیں اسی لیے ہر جگہ یہ بامعنی دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ اسے صنعت اور خدمات کے شعبوں کی ان سرگرمیوں کا مظہر قرار دیتے ہیں جنہوں نے تمام سرحدوں کو عبور کرلیا ہے اور جو کثیر ملکی کمپنیوں کے توسط سے مختلف ممالک میں سرگرداں ہیں۔ یا کچھ لوگ اسے بازار پر مبنی معیشت والے سرمایہ دارانہ نظام کے طور پر پیش کرتے ہیں جو پوری دنیا کو اپنے قبضے میں لے چکا ہے۔ یا کچھ لوگ اسے مغرب کی سیاسی بالادستی کے آلہ کار کے طور پر دیکھتے ہیں جس کے تحت سیاسی طور پر مغرب کے سیاسی نظام کو دنیا بھر میں نہ صرف تسلیم کرلیا گیا ہے بلکہ اسی کو سب سے بہتر سیاسی نظام باور کیا جاتا ہے۔ یا کچھ لوگ اسے مغربی تہذیب و ثقافت کے عالمی غلبے کے طور پر دیکھتے ہیں جس میں گلوبلائزیشن نے کثیر قومی کمپنیوں کے توسط سے ایک ایسا عالم گیر ورک کلچر جنم دیا ہے جو مختلف ملکوں کو ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ یا کچھ لوگوں کے مطابق اس گلوبلائزیشن کے نتیجے میں دنیا بھر کی معیشتیں سمٹتی جارہی ہیں اور چند بڑی کثیر قومی کمپنیوں پر منحصر ہوتی جارہی ہیں، ان کے خیال میں مغربی استعمار کی یہ نئی شکل ہے۔ یا کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ گلوبلائزیشن نے مواقع کو ضرور وسعت دی ہے البتہ یہ مواقع مبنی بر انصاف ہوں یا سب کو یکساں طور پر حاصل ہوں ایسا نہیں ہے، نتیجتاً امیر امیر تر ہوتا جارہا ہے اور غریب کی غربت کا حصار مزید تنگ ہوتا جارہا ہے۔ حرف آخر کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ گلوبلائزیشن کی تحریک یا نظام انسانی سماج اور اس کے مختلف اداروں کو ہوس زر و اقتدار پر مبنی ایک ایسی تباہی کی طرف لے جارہا ہے جو نتائج کے اعتبار سے انسانی سماج کے لیے سودمند کم اور نقصان دہ زیادہ ہے، اس نے انسان کو مادیت کا ایسا پتلا بنا دیا ہے جو اس سے پرے سوچنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا، نتیجہ کار کے طور پر یہ

تباہی شاید انسانیت کا تانا بانا ہی ادھیڑ کر رکھ دے گی۔

گلوبلائزیشن کا ایک اور مظہر عالمی سماج یا عالمی گاؤں کا تصور ہے۔ بظاہر یہ بڑی ہی خوش کن اصطلاح معلوم ہوتی ہے اور جس انداز میں اسے مشتہر کیا جاتا ہے اس کے ذریعہ یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ گویا یہ نعمت غیر مترقبہ ہے جو ہم سے پہلے لوگوں کو حاصل نہیں تھی۔ بلا شبہ گلوبلائزیشن کی تحریک کے نتیجے میں ایک عالمی سماج وجود میں آیا ہے اور یہ عالمی سماج سمٹ کر ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کے کچھ فوائد بھی ہیں البتہ یہ فوائد اس نقصان کے مقابلے میں بہت ہی معمولی ہیں جن سے انسانیت آج دو چار ہے۔ عالمی سماج یا عالمی گاؤں وجود میں آنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اب کوئی بھی سرگرمی کسی خاص خطے یا علاقے تک محدود نہیں رہی۔ عالمی ساہوکاروں اور طاقت کے ٹھیکے داروں نے اس پر ایسا تسلط حاصل کر لیا ہے کہ ہر نفع نقصان کا فیصلہ انھیں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، انھوں نے نظام عالم کو اس طرح استوار کیا ہے کہ ہر ایک دوسرے پر نہ صرف منحصر ہے بلکہ مشینی انداز میں انھیں اخلاق و اقدار کا پابند ہو کر رہ گیا ہے جن کے پیمانے انھوں نے دنیا والوں پر مسلط کیے ہیں۔ وہ چاہے دنیا کے کسی بھی مقام پر ہوں، ان کے اختیار میں ہوتا ہے کہ کہیں بھی ان کے مفادات اگر پورے نہ ہوتے ہوں تو وہاں بحرانی حالات پیدا کر دیں اور جہاں کہیں بھی ان کے مفادات حاصلہ کو کوئی خطرہ نہ ہو تو وہاں حالات کو نارمل انداز میں چلتا رہنے دیں۔

گلوبلائزیشن کے نتیجے میں جو سماجی تبدیلیاں وقوع پزیر ہوئی ہیں، ان میں کچھ تو مثبت ہیں یعنی سماج کو ان سے فائدہ ہوا ہے اور بہت ساری منفی ہیں یعنی انسانی سماج کو ان کے سبب نقصان پہنچا ہے۔ مثال کے طور پر ابلاغ اور رسل و رسائل میں بہتری آئی ہے اور بے مثال ترقی ہوئی ہے۔ یعنی رابطہ آسان اور وسیع ہوا ہے، چیزوں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی آسان اور تیز رفتار ہوئی ہے اور نتیجے میں اخراجات کم ہوئے ہیں۔ اسی طرح گلوبلائزیشن کے عمل نے اشیاء اور خدمات دونوں کی فراہمی میں کافی تنوع پیدا کیا ہے، اس تنوع کی وجہ سے سہولت اور ذوق کے مطابق انتخاب کی آزادی ملی ہے۔ تجارت کے مواقع بڑھے ہیں اور علمی استفادے کے مواقع میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گلوبلائزیشن کے نتیجے میں کثیر قومی کمپنیاں مختلف ممالک میں سرمایہ کاری کرتی ہیں، اس کی وجہ سے ملازمتوں کے امکانات بڑھتے ہیں اور ان ملکوں

کے لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔اسی طرح سماجی تنوع کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنا اور مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد کرنا آسان ہوا ہے۔

البتہ ان معمولی سہولتوں کا موازنہ اگر اس خسارے سے کیا جائے جس سے گلوبلائزیشن کے سبب موجودہ دور کا انسانی سماج دوچار ہے تو وہ بہت زیادہ نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر گلوبلائزیشن کی پوری تحریک غریبوں اور مزدوروں کی مخالف ہے۔گلوبلائزیشن کی تحریک کے نتیجے میں امیر صنعتی ملکوں کی اضافی پیداوار غریب ملکوں کے صارفین تک تو پہنچ جاتی ہے جب کہ غریب ملکوں کے اضافی مزدوروں کو امیر ملکوں میں کام کرنے کی آزادی نہیں ہے۔اسی طرح غریب ملکوں میں لگائی جانے والی کثیر قومی کمپنیوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو بہت کم اجرت دی جاتی ہے۔یہ کمپنیاں پیداواری اخراجات کم کر کے زیادہ نفع کماتی ہیں اور اس کے نتیجے میں امیر اور غریب کے درمیان کی خلیج مزید بڑھتی جارہی ہے۔زیادہ سے زیادہ منافع کے رجحان کے تحت زمینی وسائل (مثلا جنگلات، پانی اور پہاڑ وغیرہ) کا بے تحاشا استحصال ہوا اور ہو رہا ہے۔ مغرب کو آسائش و تعیش فراہم کرنے والی صنعتوں کا ملبہ تیسری دنیا کے ملکوں میں ڈالا جارہا ہے تاکہ ان کے خطرناک اثرات سے مغرب محفوظ رہے۔اسی طرح مقامی ضرورت کی اشیاء کی پیداوار کے بجائے زیادہ نفع بخش پیداواری سرگرمیوں نے لوگوں کی بنیادی ضرورتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پہلے جو ملک اپنی مقامی آبادی کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے معاملے میں بڑی حد تک خود کفیل تھے اب وہ دوسروں پر منحصر ہو کر رہ گئے ہیں۔گلوبلائزیشن کا اثر عالمی سیاست پر بھی پڑا ہے۔امیر ملکوں سے تعلق رکھنے والی کثیر قومی کمپنیاں اپنی طاقت ور سیاسی قیادت اور عالمی مالیاتی اداروں کے ذریعے ایسے بین الاقوامی قوانین اور پالیسیاں بنواتے ہیں جو ان کے مفاد میں ہوں چاہیے ان کی وجہ سے غریب ملکوں کی معیشت ہی کیوں نہ ڈوب جائے۔وہ غریب ملکوں کی سیاسی قیادت کو مختلف طریقوں سے مجبور کرتی ہیں کہ ان کے مناسب حال معاشی پالیسیاں تشکیل دی جائیں۔اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کئی کثیر قومی کمپنیاں بہت ہی با اثر اور طاقت ور ہو گئی ہیں۔ان کا بجٹ اور منافع کئی ملکوں کے بجٹ اور قومی پیداوار سے زیادہ ہوتا ہے۔ گلوبلائزیشن کی تحریک انھیں مزید طاقتور بنا رہی ہیں۔

مسلمان دنیا کی آبادی میں عیسائیوں کے بعد دوسرا سب سے بڑا مذہبی گروہ ہیں۔دنیا میں مسلم ممالک کی

تعداد ایک چوتھائی سے زیادہ ہے جہاں انھیں سیاسی اقتدار بھی حاصل ہے۔ ان کے علاوہ بھی دنیا کے تقریباً سبھی خطوں اور ملکوں میں مسلمان موجود ہیں۔ اس لیے گلوبلائزیشن کے تحت واقع ہونے والی سماجی تبدیلیوں کا چیلنج انھیں بحیثیت مسلم امت بھی درپیش ہے اور جن جغرافیائی حدود میں وہ آباد ہیں ان کے مقامی شہری کے طور پر بھی انھیں گلوبلائزیشن کے چیلنجز کا سامنا ہے۔ گلوبلائزیشن کے نتیجے میں ظہور پزیر ہونے والی سماجی تبدیلیوں کے چیلنجز کا مقابلہ بھی مسلمانوں کو انھیں دو سطحوں پر کرنا ہوگا، یعنی ایک لائحہ عمل انھیں بطور مسلم امت تیار کرنا ہوگا اور دوسرا لائحہ عمل انھیں اپنی جغرافیائی حدود میں درپیش چیلنجز کے حوالے سے تیار کرنا ہوگا۔ البتہ اس لائحہ عمل کی کچھ بنیادی دفعات دونوں سطح پر لازمی ہوں گی۔ ذیل میں اسی حوالے سے کچھ تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

گلوبلائزیشن کی تحریک کے تحت ہونے والی سماجی تبدیلیوں کا اثر سیاسی، معاشی اور ثقافتی تینوں سطحوں پر ہے البتہ موجودہ مغرب (جس میں امریکہ اور امیر مغربی یورپی ممالک شامل ہیں) ثقافتی غلبے کو اپنی ترجیحات میں سب سے اوپر رکھتا ہے کیوں کہ ثقافتی غلبہ سیاسی اور معاشی غلبے کو یقینی بنا دیتا ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ مسلمانوں میں امراء اور ارباب اختیار کا ایک طبقہ پہلے سے موجود ہے جس کو مغربی غلبے سے نہ صرف یہ کہ کوئی پریشانی نہیں ہے بلکہ وہ مقامی طور پر مغربی غلبے کا سہولت کار ہے (مسلمانوں میں یہ طبقہ استعماری دور سے موجود ہے، یہ صاحب حیثیت، خوش حال اور اقتدار میں بھی ہے)۔ مسلمانوں کے اس طبقے سے نہ تو کوئی امید کی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس کے لیے کوئی لائحہ عمل پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی مغربی غلبے کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کیا جانا چاہیے۔ البتہ اس حوالے سے ایک کوشش یہ بھی ہونی چاہیے کہ خود مسلم سماجوں میں داخلی انتشار یا تصادم کی صورت نہ پیدا ہونے پائے یا اگر ایسا ناگزیر ہو تو کم سے کم سطح پر ہو۔ مجوزہ لائحہ عمل کی دو سطحیں ہوں گی، ایک سطح اخلاقی بلکہ زیادہ مناسب الفاظ میں روحانی ہوگی اور دوسری سطح مادی ہوگی۔

اخلاقی یا روحانی سطح پر مسلم امت کے لائحہ عمل کا پہلا اصول یہ ہونا چاہیے کہ وہ جس عقیدے (عقیدہ توحید و رسالت و معاد) کا اقرار زبان سے کرتی ہے، اس کا عمل بھی اس کا گواہ بن جائے۔ اللہ اور رسول (محمد ﷺ) سے اس کا تعلق اس قدر مستحکم اور مضبوط ہو جائے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے

اور آخرت کی جواب دہی کا تصور اسے ہر دنیوی لالچ سے بے نیاز کر دے۔ بحیثیت امت مسلمانوں کا تعلق اللہ اور رسول سے جب ایسا مضبوط ہو جائے گا اور خوف خدا ان کے دلوں میں جا گزیں ہوگا تو پھر دنیا کا کوئی بھی چیلنج ان کے راستے کا روڑا نہیں بن سکے گا۔ اس لائحہ عمل کا دوسرا اصول اتحاد امت کا قرآنی تصور ہے جو مسلم امت کو رنگ و نسل اور زبان و جغرافیے کی بنیادوں سے اوپر اٹھا کر ایک خدا، ایک رسول اور ایک قبلہ کی بنیاد پر اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پروتا ہے (الانبیاء آیت ۹۲)، جہاں تقوی کرامت کی بنیاد ہے (الحجرات آیت ۱۳) اور بحیثیت امت مسلمانوں کو ذمہ دار گروہ قرار دیا گیا ہے (البقرہ آیت ۱۴۳)۔

موجود مسلم امت کا المیہ یہ ہے کہ وہ اتحاد کے اس تصور کو چھوڑ کر مغرب کی نقالی میں متعدد لسانی، جغرافیائی، نسلی اور دیگر عصبیتوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ جب کہ اس کی صرف اور صرف ایک شناخت آخری نبی کی امت کی شناخت (انا آخر الانبیاء وانتم آخر الامم [ابن ماجہ کتاب الفتن باب فتنۃ الدجال] میں آخری نبی اور تم آخری امت ہو) ہونی چاہیے۔ اس لائحہ عمل کا تیسرا اصول اسلامی اقدار، جو فی الواقع انسانی اقدار ہیں، کا تحفظ اور فروغ ہونا چاہیے۔ موجودہ دور کی مسلم امت کے سامنے اسلامی اقدار (مثلا صدق، حیا، عفت، غیرت، عدل، احسان، معروف و منکر اور شفقت و رحمت وغیرہ) کا تحفظ بہت بڑا چیلنج ہے۔ مغرب نے موجودہ دور میں اقدار کا تصور ہی بدل دیا ہے، اس نے قدروں کو اضافی چیز قرار دے کر مفادات کے تابع کر دیا ہے۔ جب کہ اسلام ہر حال میں اقدار کے تحفظ اور فروغ کو یقینی بنانے کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے انحراف کو اسلام سے انحراف قرار دیتا ہے۔

مسلم امت کے لیے مجوزہ لائحہ عمل کی دوسری یعنی مادی سطح میں سیاسی اور معاشی نظاموں میں اصلاح شامل ہے۔ مغرب کی دنیا پر بالادستی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے سیاسی اور معاشی نظام کو بغیر کسی چیلنج کے حق تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مغربی نظام سیاست و معیشت سے باہر بھی کوئی نظام ہوسکتا ہے، دنیا کے بہترین دماغوں نے شاید اس بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ لیکن رسول ہاشمی کی پیروکار مسلم امت اپنی ترکیب میں بہت ہی خاص ہے، وہ جس مذہب، مذہب اسلام، کو مانتی ہے وہ مکمل نظام حیات ہے یعنی اس کا سیاسی و معاشی نظام بھی ہے۔ موجودہ زمانے کی مسلم امت کا المیہ یہ ہے کہ دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی سے بھی زیادہ حصہ ہونے کے باوجود وہ آج کی دنیا کی سیاست و معیشت میں کسی خاص کردار کی حامل نہیں ہے۔

پچاس سے زیادہ مسلم مما لک ہیں، بظاہر انھوں نے اسلامی تعاون کی تنظیم (او آئی سی) بھی بنا رکھی ہے جو اقوام متحدہ کے بعد دوسرا بڑا پلیٹ فارم ہے۔ البتہ عالمی سطح پر اس کا کوئی کردار کبھی نہیں رہا، اکثر وبیشتر یہ مغربی استعماری طاقتوں کے آلہ کار کے طور پر کام کرتی رہی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ او آئی سی جیسی تنظیموں کو فعال اور موثر کردار کا حامل بنایا جائے اور انھیں مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنانے کے بجائے مسلم امت کا نمایندہ ادارہ بنایا جائے۔ اس میں مسلم اکثریتی علاقوں کے مسائل کے ساتھ اقلیتی مسلم معاشروں کے مسائل پر نہ صرف یہ کہ بحث وگفتگو ہونی چاہیے بلکہ اسے دنیا کی مسلم اقلیتوں کی آواز بنانے کی بھی شدید ضرورت ہے۔

جہاں تک معیشت اور معاشی نظام کی بات ہے تو اس میں مسلم دنیا کی نمایندگی کے لیے او آئی سی جیسی تنظیم بھی نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کو مسلم دنیا کے نظام معیشت کے طور پر پوری طرح اختیار کر لیا گیا ہے۔ اور وہ بھی سود، بینک اور اسٹاک ایکسچینج کی بھول بھلیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ مسلم امت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنا نظام معیشت تشکیل دے، جس میں سود اور اسٹاک ایکسچینج کی قیاس آرائی کے لیے کوئی جگہ نہ ہو۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا مسلم امت کی مغرب سے گلوخلاصی اور تعمیر وترقی ممکن نہیں۔ بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے میں، جو گلوبلائزیشن کے حصار میں ہے اور جس پر مغرب کو غلبہ حاصل ہے، مسلم امت اور اتحاد اسلامی کا خواب اسی وقت شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے جب اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے نہ صرف لائحہ عمل ترتیب دیں گے بلکہ اس پر عمل آوری کو بھی یقینی بنائیں گے۔

مکالمہ بین المذاہب کی موجودہ صورت حال اور اسلامی نقطہ نظر

محمد صادر ندوی

ٹیکنالوجی کی ایجاد اور علمی و سائنسی ترقیات کے نتیجہ میں اکیسویں صدی کی اہمیت تاریخ انسانی میں مسلم ہے۔ اس صدی میں تہذیب وثقافت اور مذہب وعقائد کے باب میں ایک دوسرے کو جاننے، سمجھنے اور سمجھانے کے جو مواقع میسر آئے ہیں، اس کی نظیر پیش کرنے سے ماضی کی تاریخ بہر حال قاصر ہے۔ دعوت اسلامی کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ کلیسا کے ظلم واستبداد کے نتیجہ میں یورپ کے سینوں میں مذہب کے خلاف جو انگارا سالوں سال سلگتا رہا، اب اس کی لپک دھیمی ہوتی نظر آرہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ سوالات ہیں جو جدید نسل کو درپیش ہیں اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے دنیا پھر سے ایک بار مذہب کا مطالعہ کرنے پر مجبور ہے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ مطالعہ ادیان ومذاہب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی، اور مختلف عقائد ونظریات کے حاملین ایک اسٹیج پر بیٹھ کر ایسے اصول واقدار کی تلاش میں ہیں جنھیں انسانیت کی فلاح وبہبود، ملک وقوم کی ترقی، مصنوعات وایجادات کے صحیح استعمال، بین الاقوامی تجارت ولین دین اور آپسی تعلقات کو استوار کرنے میں استعمال کیا جا سکے۔

تکثیری سماج میں دعوت دین کے مواقع

ایسی صورت حال میں امت مسلمہ جو دراصل امت دعوت ہے اور اپنے کلچر، ثقافت اور تہذیب وتمدن کے اعتبار سے سب سے نمایاں ہے، اس کے پاس دعوت کے امکانات اور پیغام محمدی کو دوسروں تک پہنچانے کے ذرائع بھی آسان ہو گئے ہیں۔ مکالمہ یا ڈائیلاگ، موجودہ دور میں جس کی ابتدا مغربی دنیا سے ہوئی ہے، اگرچہ اس کے پیچھے ان کے مقاصد کارفرما ہیں؛ لیکن اس کے باوجود دعوت کے ایک اہم وسیلہ کے طور پر ہم اس کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کا اصول اس تناظر میں بڑی اہمیت کا حامل ہوگا کہ Dialogue یا مکالمہ کی حیثیت موجودہ دور میں اس حد تک مسلم ہوگئی ہے کہ اس سے صرف نظر کرنا فائدہ کے بجائے عظیم خسارہ کا سبب بن سکتا ہے۔ کیوں کہ تکثیری سماج کے اس دور میں دوسری اقوام کی نفسیات، اس کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہونا ایک اہم ضرورت بن گئی ہے۔ ڈاکٹر جان حبیب لکھتے ہیں کہ

موجودہ دور میں باہمی افہام وتفہیم اور دوسروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا جتنا اہم ہو گیا ہے، شاید کبھی انسانی تاریخ میں اتنی ضرورت محسوس ہوئی ہو ا۔'' Perhaps at no time in history has the need for mutual understanding and knowledge about others been so critical. ڈاکٹر راغب سرجانی مکالمہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''انسانی تاریخ میں کسی بھی نظریہ یا مذہب کے فروغ میں سب سے پہلا رول ڈائیلاگ کا رہا ہے۔ اسی طریقہ سے کسی نظریہ کے حاملین، اور اس کو پسند کرنے والوں کا ظہور ہوتا ہے، اور پھر دوسرے مرحلہ میں جا کر عام انسانی عقل کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ حتی کہ انبیاء کرام کے علاوہ جن حکما کی طرف کسی فکر وفلسفہ کی طرف نسبت کی جاتی ہے، ان کا پہلا مرحلہ بھی ڈائیلاگ ہی تھا، چاہے وہ بدھ مذہب کے علم بردار ہوں یا ہندومت کے فلاسفر، Confucius ہوں یا چینی حکما اور فلاسفر، اسی طرح یونانی فلسفیوں میں سے ہر ایک نے اسی طریقہ کو اپنا پہلا وسیلہ بنایا ہے''۔ ۲؎

مکالمہ کے اقسام

البتہ یہ ذہن نشیں رہے کہ ڈائیلاگ یا مکالمہ کی مقاصد کے اعتبار سے الگ الگ نوعیتیں اور مختلف اقسام ہیں۔ اگر ان کے درمیان فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تو پھر خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ بالفرض اگر سیاسی مکالمہ میں مذہب کو زیر بحث لائیں تو اس کو حماقت سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے، نیز مخاطب کی ذہنیت کو سمجھنے کے لیے بھی نوعیت کی تحدید ضروری ہے، اسی طرح کبھی نوعیت کو دیکھ کر ہی اس میں شامل ہونے یا کنارہ کشی اختیار کرنے کا دار و مدار ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر اس کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

سماجی یا سیاسی مکالمہ:

اس میں سیاسی، سماجی، قومی و بین الاقوامی سطح پر کیا جانے والا ہر مذاکرہ شامل ہے۔ کبھی یہ حکومت کے زیر نگرانی اور حکومتی افراد کے درمیان ہوتا ہے اور کبھی مختلف مذاہب کے افراد کے درمیان۔ اس کے مقاصد میں آپسی لین دین، بین الاقوامی تجارت کا فروغ، ملکوں کے باہمی تعلقات کی مضبوطی، شر پسند عناصر اور متشدد جماعتوں کی بیخ کنی، ملک میں امن وامان کے قیام کی طرف توجہ اور بوقت ضرورت ایک دوسرے کا مالی تعاون، اسی طرح سوسائٹی میں بلند اقدار کا فروغ، انسانیت نوازی، ایثار وہمدردی کی فضا ہموار کرنا اور ایسے

پُرامن ماحول کی فراہمی جس میں ہر فرد چین اور سکون کی سانس لے سکے، وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

اسلام کا مقصد ہی چوں کہ روئے زمین سے ظلم وفساد کو مٹا کر عدل وانصاف کا نظام قائم کرنا ہے، جس کے اشارے جگہ جگہ اس کی تعلیمات میں ملتے ہیں، اس لیے اس طرح کے مذاکرات میں بھی اس کے علم برداروں کا حصہ لینا مستحسن عمل ہے، موجودہ دنیا Environment، Economic، اسی طرح عالمی طاقتوں کے باہمی تصادم، نوجوانوں کی بے راہ روی، نشہ خوری اور خودکشی کے بڑھتا رجحان کا سامنا کر رہی ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن کا حل پیش کرنے کے لیے لازمی طور پر مسلمانوں کو آگے آنا چاہیے اور ایسے مذاکرات میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لینا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت میں اس کی سب سے واضح مثال حلف الفضول کا واقعہ ہے، جو نبوت سے قبل حرب فجار کے چار ماہ بعد مکہ میں پیش آیا تھا، اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک ۲۰ سال تھی۔ اس واقعہ کی معنویت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے نبوت کے بعد ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا ’’لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم، ولو أدعىٰ به في الاسلام لأجبت‘‘ ۳۔ میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدہ میں شریک تھا جو مجھے سرخ اونٹنی سے بھی زیادہ عزیز ہے، اگر مجھے آج بھی اسلام میں اس جیسے معاہدہ کی دعوت دی جائے تو میں ضرور قبول کروں گا۔ آپؐ کے اس قول سے بجا طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام نے ظلم وفساد کو روکنے پر کتنا زور دیا ہے اور ایسے معاہدے جن میں سماج میں پنپنے والی برائیوں پر قدغن لگائی جا سکے، اس میں شرکت کس درجہ اہمیت رکھتی ہے۔

دنیا میں اس وقت جمہوری نظام کا غلبہ ہے، جس کی رُو سے ہر مذہب کے حامل کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی دعوت وتبلیغ کی بھر پور اجازت ہے؛ لیکن اس کے باوجود چند سالوں سے خاص طور پر ہمارے وطن عزیز میں مسلمانوں کو اس راہ میں مشکلات کا سامنا ہے، مسلمانوں کی طرف سے اگر دعوتی کام انجام دیا جاتا ہے اور اس سے متأثر ہوکر لوگ حلقۂ اسلام سے منسلک ہو رہے ہیں تو اس عمل کو ’زبردستی تبدیلئ مذہب‘ کا نام دے کر داعیان کو جیلوں میں بھرا جا رہا ہے۔ ایسے موقعے پر ہمیں صلح حدیبیہ سے سبق لیتے ہوئے بااثر افراد کے سہارے حکومتی سطح پر ایسے معاہدات کرانے چاہییں، جن کی رو سے دعوت کی راہ میں پیش آمدہ اس مشکل کا حل نکالا جا سکے۔

دینی مکالمہ:

یہ وہ مکالمہ ہے جومختلف مذاہب کے افراد کے درمیان ہوتے ہیں۔قرآن کریم کی سورۂ آل عمران کی آیت ’’قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۶۴) اسی نوعیت کے مکالمہ کی دعوت دی گئی ہے۔مکالمہ بین المذاہب کے نام سے فی زمانا مغرب سے جس مکالمہ کی دعوت دی جارہی ہے، وہ ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت ہے، جوملت ابراہیمی کے نام پرادیان سماوی (اسلام، یہودیت،نصرانیت) کواپنے ماضی کے اختلافات کوبھلا کرایک پلیٹ فارم پر متحد ہوکرتینوں ادیان کی مشترکہ خصوصیات کوسامنے رکھتے ہوئے ایک نئے مذہب کی تشکیل کی دعوت دیتا ہے،جس میں تشدد، قدامت پسندی اور’دینی تعصب‘ نہ ہو۔اس نقطۂ نظر کے تحت چند اصطلاحات بھی رائج ہیں:

تقریب بین الادیان، وحدت ادیان،توحیدادیان،ملت ابراہیمی،اسلامی مسیحی بھائی چارگی، بقائے باہم کے اصول وغیرہ۔اوران تمام میں مشترک چیزیہ پائی جاتی ہے کہ مختلف فیہ چیزوں کوچھوڑ کریاان سے صرف نظر کرتے ہوئے متفقہ اصولوں پر معاہدہ کرلیا جائے۔تمام ادیان میں کچھ نہ کچھ خوبیاں موجود ہیں ان کوجمع کرکے ایک ملغوبہ تیار کیا جائے اوروہی اکیسویں صدی کا مذہب ہو،جس میں حالات کا مقابلہ کرنے اور نئے مسائل کا سامنا کرنے کی بھرپورصلاحیت موجود ہو۔ذیل میں’تقریب بین الادیان‘ کی وضاحت کی جارہی ہے:

تقریب بین الادیان(Interfaith Rapprochement)

اس اصطلاح کا مطلب ہے’’ملت ابراہیمی کو بنیاد بنا کرادیان سماوی (اسلام، یہودیت،عیسائیت) کے درمیان تقارب،ہم آہنگی پیدا کرنا،اس اعتقاد کے ساتھ کہ تینوں ادیان سماوی برحق اور برابر ہیں، ان میں کسی قسم کا تعارض نہیں ہے [۴]۔دوسرے لفظوں میں اپنے ماسبق ادیان کی مختلف فیہ باتوں کوچھوڑ کرملت ابراہیمی کے جھنڈے تلے جمع ہونے کا نام تقریب بین الادیان ہے۔

تقریب بین الادیان اوران جیسی اصطلاحات کا حقیقی مفہوم سمجھنے کے لیے ہمیں اس کی تاریخ اورعملی سرگرمیوں

پر بھی نظر ڈالنی ہوگی، جو تقریب کے ضمن میں انجام دی جا رہی ہیں:

۱۹۶۲ــ۱۹۶۵ میں رومن کیتھولک چرچ کے ہیڈ کوارٹر vatican میں دوسری عالمی ویٹکن کونسل کا انعقاد ہوا۔ اس کے اول محرک چرچ کے ۲۳ ویں پادری سینٹ جان (Saint John XXIII) تھے۔ کونسل میں بشمول کیتھولک بشپ دنیا کے بھر کے بڑے بڑے پادری مدعو تھے۔ جس کا مقصد چرچ کی روحانی تجدید، عیسائی اتحاد، چرچ نظام میں موجود خامیوں کو دور کرتے ہوئے ایسا لائحۂ عمل تیار کرنا جس سے عیسائیت کے فروغ کی راہ ہموار ہوسکے، تھا۔ اس کونسل میں سولہ اہم دستاویزات تیار کیے گئے، چرچ کی مشنری سرگرمی، عام لوگوں تک رسائی، اسی طرح غیر مسیحی مذاہب کے تئیں چرچ کا موقف وغیرہ اس دستاویز کے اہم اجزا ہیں ۵ ۔

ان دستاویزات میں جہاں انھوں نے عیسائی مشنریز کو مزید سرگرم کرنے کی بات کہی ہے، وہیں ان کے مطمح نظر یہ بھی ہے کہ عیسائیوں کے علاوہ دیگر ادیان ومذاہب کے لوگ بھی ہماری دعوت کے مخاطب ہیں۔ چنانچہ دین اسلام کے سلسلہ میں جواب تک ان کا سب سے بڑا حریف اور مدمقابل تھا، اس بابت اب ان کی رائے میں نرمی آجاتی ہے اور لکھتے ہیں کہ

''وتنظر الكنيسة أيضاً بتقدير الى المسلمين الذين يعبدون الله الواحد...ولئن كان قد وقع في غصون الزمن، كثير من المنازعات والعداوات بين المسيحين والمسلمين، فإن المجمع يحرضهم جميعاً علىٰ نسيان الماضي، والعمل بأجتهاد صادق في سبيل التفاهم في مابينهم، وأن يحموا ويعزوا كلهم معاً، من اجل جميع الناس، العدالة الاجتماعية، والقيم الروحية، والسلام والحرية ۶ ۔

چرچ مسلمانوں کو بھی احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جو کہ ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں ... اگرچہ ماضی میں مسیحی اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے اور دشمنیاں رہ چکی ہیں؛ لیکن انھیں اپنے ماضی کو بھلا دینا چاہیے اور تفاہم باہمی کی غرض سے مبنی بر انصاف کوشش کریں، ایک دوسرے کی حمایت وتائید کریں، اور اجتماعی عدالت، روحانی اقدار اور امن وامان کے قیام کے لیے کوشاں ہوں۔

یہ بات ذہن نشیں رہے کہ موجودہ دور میں تقریب بین الادیان کی یہ دعوت کوئی نئی نہیں ہے، بلکہ اس کے پہلے علم بردار سید جمال الدین افغانی ہیں۔ چنانچہ ان کا نظریہ کچھ اس طرح ہے:

''...هكذا نجد الأديان الثلاثة، الموسوية، والعيسوية والمحمدية على تمام الاتفاق في المبدأ والغاية، إذا نقص في الواحدة شيء من أوامر الخير المطلق استكملته الثانية ...لقد لاح لي بارق أمل كبير أن تتخذ أهل الأديان الثلاثة مثل ما اتحدت الأديان في جوهرها وأصلها وغايتها، وبهذا الاتحاد يكون البشر قد خطوا نحوا لسلام خطوة كبيرة في هذه الحياة القصيرة۔''[۷]

ہم ادیان ثلاثہ یعنی دین موسوی، عیسوی اور محمدی کو اپنے مقصد اور اصل کے اعتبار سے ایک ہی پاتے ہیں۔ خیر کے کسی معاملہ میں جہاں ایک جگہ کمی نظر آتی ہے دوسرے سے اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ میرے لیے اس میں امید کی ایک کرن نظر آئی کہ تینوں ادیان کے حاملین اسی طرح متحد ہو جائیں جس طرح ان کے درمیان جوہری اور مقصدیت کا اتحاد پایا جاتا ہے اس اتحاد سے انسانیت اس مختصر سی زندگی میں امن وامان اور سلامتی کی راہ پر گامزن ہو سکے گی۔

سید افغانی کی اس تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے **دعوۃ التقریب** کے مصنف رقم طراز ہیں:[۸]

''افغانی کی نظر میں وحدت ادیان صرف مقصدیت اور اصل کے اتحاد کا نام نہیں ہے بلکہ وہ 'تلفیق' کے نظریہ کے حامل ہیں، یعنی ایک مذہب میں موجود کمی کو دوسری مذہب کی خوبی سے پورا کر دیا جائے۔ عبارت بالا سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام ان کے نزدیک ادیان سابقہ کا ناسخ نہیں ہے، بلکہ تینوں ادیان برابر ہیں''۔

دراصل تقریب بین الادیان یا وحدت ادیان کا نظریہ صوفیاء کے وحدۃ الوجود کے نقطۂ نظر سے مستفاد معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ وحدت الوجود میں مختلف ادیان ومذاہب کی حیثیت وہی ہے جیسے اسلام میں مختلف فقہی مذاہب کی، جس طرح انسان قرآن وسنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی نظریہ کو اپنا سکتا ہے، اور جب چاہے اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو اپنا لے، اسی طرح مذاہب کے سلسلے میں بھی ان کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ امام ابن تیمیہ ''**الرد علی المنطقیین**'' میں رقم طراز ہیں:

''ابن سبعین اوران کے پیروکار جیسے فلاسفر اور صوفیاء کے نزدیک جائز ہے کہ انسان، یہودی، عیسائی یا مشرک رہے اور بتوں کی پوجا کرے، اسلام کو اختیار کرنا ان کے نزدیک ضروری نہیں ہے اور نا یہودی یا نصرانی ہونا یا شرک کرنا ممنوع ہے؛ البتہ کبھی کبھی وہ اسلام کی شریعت کو دوسری شریعتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب ان کے کسی شیخ کے پاس مرید آتا ہے اوران کے ہاتھ پر بیعت کاارداہ ظاہر کرتا ہے تو شیخ اس سے کہتا ہے: مسلمانوں کے دین پر، یا یہودی یا عیسائی کے دین پر بیعت کروں؟ جب مرید کہتا ہے کیا یہود ونصاریٰ کافر ہیں تو شیخ کہتا ہے: نہیں، لیکن مسلمان ان سے بہتر ہیں۔'' ۹؎

اوپر کے حوالوں سے واضح ہوا کہ اس پُرفریب دعوت کی علم بردار جہاں ایک طرف عیسائی دنیا ہے، وہیں اس کے اثرات خود مسلمانوں کے یہاں موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں کے لیے یہ ایک اچھا قدم تھا اور انھوں نے اس پر لبیک کہا۔ چنانچہ سید جمال الدین کے بعد ان کے شاگردوں اور پھر ان سے متأثر ہونے والوں کا ایک سلسلہ ہے جنھوں نے اس جانب پیش قدمی کی ہے۔

مکالمہ کے مغربی اہداف ومقاصد

Dr. Alexie Jaurafsky جو ایک Russian مؤلف ہیں، انھوں نے'' Islam and christianity'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو عربی میں ''الاسلام والمسیحیۃ'' کے نام سے شائع ہوئی ہے اور جامع ازہر کے وائس چانسلر شیخ محمود حمدی زقزوق نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ اس میں انھوں نے قدیم دور سے اب تک مسیحیوں کا اسلام کے سلسلے میں نظریات اور پھر اخیر کے زمانے میں اسلام کے تئیں ان کے موقف میں جو تبدیلی آئی ہے، اس پر بڑی اچھی گفتگو کی ہے۔ وہ اسلام کے سلسلہ میں چرچ کے جدید نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اسلام اور مسیحیت کے وجود کے بعد سے ۱۴۰۰ سال بعد پہلی مرتبہ چرچ نے سکنڈ عالمی ویٹیکان میں اپنے موقف میں تبدیلی لاتے ہوئے اسلام کے سلسلہ میں مثبت نظریہ قائم کیا اور اس کی دینی خصوصیات کا اعتراف کیا ہے۔ اور یہ اس وقت ہوا جب کہ ۱۹۵۷ء میں PIUS XII نے اپنی ایک تحریر Fiedi Donum میں یہ واضح کیا کہ افریقہ میں اسلام کے بڑھتے اثرات اور تیزی سے اس کی اشاعت چرچ کے لیے ایک خطرہ ہے۔ اسی طرح ایک اور کتاب جو چار جلدوں میں ''تاریخ الارسالیات الکاثولیکیۃ'' کے نام سے اسی سال منظر عام پر آئی، اس میں مؤلف نے یہ دکھایا ہے کہ

اسلام کی عالمی سرگرمیاں کمیونزم کے لیے ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔" ۱۰؎

ڈاکٹر الیکسی کی اس تحریر سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ عیسائیوں نے اسلام اور اہل اسلام کے سلسلہ میں اپنے نظریہ میں جو تبدیلی پیدا کی ہے، وہ ان کی ایک سازشانہ چال ہے، اسلام کے بڑھتے عالمی اثرات سے ان کو خطرہ محسوس ہوا، لہٰذا انھوں نے بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو ماضی کی طرح مسلمانوں کا حریف اور مدمقابل ظاہر کرتے، ایک دوست کی پیش کیا، جو مسلمانوں کا خیر خواہ ہے، ان سے ڈائیلاگ کرنا چاہتا ہے، تاکہ قدم سے قدم ملا کر اعلیٰ اقدار کو فروغ دیا جاسکے۔ جب کہ اس کا باطنی پہلو یہ ہے کہ وہ خود مسلمانوں کے اندر گھس کر ان کی ایمانی بنیادوں کو متزلزل کرنا چاہتے ہیں، اسلامی شناخت کو مٹا کر ملت ابراہیمی میں ضم ہوجانے کو بھی اسی تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ہماری اس گفتگو کی تائید خود ان کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ سکنڈ عالمی ویٹیکان میں جو دستاویزات انھوں نے تیار کیے، ان میں جگہ جگہ ایسے افراد کی تیاری پر زور دیا گیا ہے، جو زمانے کے اسلوب سے اچھی طرح واقف ہوں اور مکالمہ کا ذمہ بھی انہی کو سونپا گیا ہے۔ ۱۱؎

قرآن میں کلمۂ سواء کی دعوت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ بات دودو چار کی طرح واضح ہے کہ ڈائیلاگ کے پس منظر میں عیسائیوں یا مغربی دنیا کی نیت اچھی نہیں ہے، وہ اس کے ذریعہ سے دین اسلام کی شناخت کو مٹانا چاہتے ہیں، یا یہ عیسائی مشنریز کو عام کرنے کا ایک آلہ ہے تو پھر اس کے تئیں ہم مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ کیا ہم مکالمات سے دوری اختیار کرلیں، حالاں کہ اس کی ضرورت ہر خاص وعام محسوس کر رہا ہے؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ قرآن کریم میں اولاً تو انبیائی مکالمات کا ایک سلسلہ موجود ہے، جس میں انھوں نے اپنی قوم سے خطاب کیا ہے۔ اسی طرح ایک بڑی اہم آیت وہ بھی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی زبانی اہل کتاب بالخصوص عیسائیوں کو مکالمہ کی دعوت دی گئی ہے، اور اسی کو بنیاد بنا کر اللہ کے رسول ﷺ نے کئی وفود کے ساتھ مباحثے بھی کیے ہیں، جن میں وفد نجران کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا

اللّٰهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّٰهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (سورۃ البقرۃ: ٦٤)

اے محمد ﷺ ! آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہیں۔ وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا رب نہ بنائے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی واطاعت کرنے والے) ہیں۔

اس آیت کریمہ نے معاملہ کو دو دو چار کی طرح واضح کر دیا کہ اہل کتاب سے مسلمانوں کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ اس 'کلمۂ سواء' پر آ کر متحد ہو جائیں جس کی تعلیمات پچھلی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ وہ کلمۂ سواء کیا ہے؟ قرآن نے متعدد مقامات پر اس کی وضاحت کر دی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ شوریٰ آیت ۱۳ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحاً وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللّٰهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ- اس آیت میں صاف طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ تمام انبیاء کا دین ایک ہی رہا ہے۔ کلمۂ سوا والی آیت میں بھی اسی دین کی طرف بلایا گیا ہے۔

لہذا مسلمانوں کا موقف مکالمہ کے سلسلہ میں پیش قدمی کا ہونا چاہیے۔ خواہش پرستوں کا مہمان بننے کے بجائے اگر وہ میزبانی کی پوزیشن میں آ جائیں تو پھر اہداف اور اصول وضوابط بھی مسلمانوں کے ہوں گے۔ لیکن چوں کہ ہم نے مہمانی کو ترجیح دی اور اس میدان میں پیش قدمی کے بجائے غیروں کے پیچھے چلتے رہے جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ اصول وضوابط بھی ان کے اور نتائج واثرات بھی انہی کے حق میں ہیں۔ ہماری حیثیت پالکی کے پچھلے کندھے کی طرح یا انجن کے آخری ڈبے کی طرح ہو گئی کہ اگلا ڈبہ جدھر مڑے گا ہمیں مجبوراً اس کی پیروی کرنی ہوگی۔ جب کہ اگر اس جانب ہم نے پیش قدمی کی ہوتی تو آج مشترک اقدار کا مطلب مداہنت وچاپلوسی نہ ہوتا، امن وسلامتی کی فضاد کو پروان چڑھانے کا مطلب اپنے گھناؤنے مقاصد کو بروئے کار لانا نہ ہوتا اور نہ مذہب کے نام پر سیاست کی روٹی سینکنے کا کسی کو موقع ملتا۔ ڈاکٹر عثمان التویجری اس افسوس ناک صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں" یہ بات قابل ذکر ہے کہ گزشتہ زمانے میں مذاکرات کے

تصور کی ابتدا مشرق سے نہیں بلکہ مغرب کی جانب سے ہوئی، اور ان مذاکرات کے پیچھے متعین مقاصد اور اہداف تھے، جس خطہ کی مالی پوزیشن مضبوط ہو اور جو سیاسی اثر و نفوذ رکھتا ہو، حالات وواقعات کی زمام جس کے دست تصرف میں ہو، اس کی جانب سے مذاکرات کی پیش کش اگر ہوگی تو یقیناً اس کا فائدۂ پایان کار اس کو ملے گا۔''۱۲؎

البتہ چوں کہ یہ وادی بہت پُرخطر بھی ہے اور یہ ایک نازک ذمہ داری کا کام بھی ہے، اس لیے اس میدان میں ان لوگوں کو آگے بڑھنا چاہیے، جن کا موضوع پر گہرا مطالعہ ہو، تا کہ وہ دنیا کے سامنے دین اسلام کی حقانیت کو بجا طور پر ثابت کریں اور ساتھ میں فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بھی ادائیگی ہو۔ نیز چوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ قوم جو ہمیں حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ دام فریب میں لا کر ہماری اسلامی شناخت اور اس کی شفافیت کو داغدار کرنا چاہتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نفسیات سے باخبر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرہ:۱۲۰) تو ایسے موقع پر ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کے اسوۂ مبارکہ سے روشنی حاصل کرنی چاہیے کہ آپ کو بھی دشمنان اسلام نے دین کے معاملہ میں مصالحت کی پیش کش کی تھی ''تعبد الهنا سنة اللات والعزیٰ، ونعبد الهك سنة''۱۳؎ آپ ایک سال ہمارے معبودوں لات وعزیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے۔

دین اسلام کی راہ میں جو مشکلات درپیش آ رہی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اہل دین کو باطل کی طرف سے پُرفریب حیلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعینہ یہی صورت حال ڈائیلاگ کے تناظر میں مسلمانوں کو پیش آ رہی ہیں؛ ہمارے سامنے رسول اکرم ﷺ کا اسوہ موجود ہے کہ آپ نے ایسے موقع پر کسی طرح کی مصالحت گوارا نہیں کی؛ لیکن آپ نے ان کے ان چالوں کی وجہ سے دعوت کا فریضہ ادا کرنا نہیں چھوڑا۔ یہی موقف ہم مسلمانوں کا بھی ہونا چاہیے کہ ان کے سامنے سپر ڈالنے یا ڈائیلاگ کے میدان سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بجائے اس میں بھرپور حصہ لیا جائے اور دین اسلام کی حقانیت کو دنیا کے پیش کیا جائے۔

حوالہ جات

1- Interfaith Dialogue Cross- Cultural Views. Gainaa publications,

first:2010, p: 110

۲- المشترك الانسانی- نظرة جديدة للتقارب بين الشعوب-ڈاکٹر راغب السرجانی، مؤسسة اقرأللنشر والتوزيع والترجمة، القاهرة، الطبعة الأولی ۲۰۱۱۔ ص ۵۸۹

۳- الروض الأنف، ابو القاسم عبد الرحمن بن عبد الله بن احمد السهيلی ۵۸۱ھ، دار احياء التراث العربی، الطبعة الاولی ۱۴۱۲ھ، الجزء الثانی، ص ۵۷

۴- دیکھیے: الجمهرة، معلمة مفردات المحتوی الاسلامی، ضمن المصطلحات الدينية

5- https://www.britannica.com/event/Second-Vatican-Concil

۶- الكنيسة الكاثوليكية فی وثائقها، ترجمه المطران يوحنا المنصور-الاب حنا الفاخوری۔ منشورات المكتبة البولسية۔ الطبعة الاولی ۲۰۰۱۔ الجزء الثانی، ص ۹۹۰

۷- الأعمال الكاملة لجمال الدين الافغانی۔ د۔ محمد عمارة، القاهرة، ۱۹۶۸۔ ۲۹۵-۲۹۰

۸- دعوة التقريب بين الاديان۔ ص ۳۹۹

۹- الرد علی المنطقيين، ابن تيميه، المقام الرابع۔ ص ۲۸۲

۱۰- الاسلام والمسيحية۔ د ۔اليكسی جورافسكی۔ عالم المعرفة ۱۹۹۶، ص ۱۱۷

۱۱- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: التبشير والاستعمار فی البلاد العربية۔ د مصطفیٰ خالد، د عمر فروخ۔ المكتبة العصرية، بيروت۔ صيدا۔ الطبعة الخامسة، ۱۹۷۳۔ ص ۲۵۷-۲۵۹

۱۲- مذاکرات برائے بقائے باہم، ترجمہ: پروفیسر محسن عثمانی، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی ۲۰۰۵۔ ص ۱۶

۱۳- المعجم الكبير للطبرانی۔ ۵۱۷

اردو لکھنے میں کی جانے والی بارہ غلطیاں

انتخاب وتحریر: ڈاکٹر معین الدین عقیل

پہلی:

اردو کے مرکب الفاظ الگ الگ کر کے لکھنا چاہییں، کیوں کہ عام طور پر کوئی بھی لفظ لکھتے ہوئے ہر لفظ کے بعد ایک وقفہ (اسپیس) چھوڑا جاتا ہے، اس لیے یہ خود بخود الگ الگ ہوجاتے ہیں۔

دراصل تحریری اردو طویل عرصے تک 'کاتبوں' کے سپرد رہی، جو جگہ بچانے کی خاطر اور کچھ اپنی بے علمی کے سبب بہت سے لفظ ملا ملا کر لکھتے رہے۔ جس کی انتہائی شکل ہم 'آبخشبکو' کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ بہت سے ماہرِ لسانیات کی کوششوں سے اب الفاظ الگ الگ کر کے لکھے تو جانے لگے ہیں، لیکن اب بھی بہت سے لوگ انہیں بدستور جوڑ کر لکھ رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب یہ اردو کے الگ الگ الفاظ ہیں، تو مرکب الفاظ کی صورت میں جب انہیں ملا کر لکھا جاتا ہے، تو نہ صرف پڑھنا دشوار ہوتا ہے، بلکہ ان کی 'شکل' بھی بگڑ جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل میں ان الفاظ کی بارہ اقسام یا 'طرز' الگ الگ کر کے بتائی جارہی ہیں، جو دو الگ الگ الفاظ ہیں یا ان کی صوتیات / آواز کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں الگ الگ کر کے لکھنا ضروری ہے۔

*جب کہ، چوں کہ، چناں چہ، کیوں کہ، حالاں کہ

*کے لیے، اس لیے، اس کو، آپ کو، آپ کی، ان کو، ان کی (یہ بھی واضح رہے کہ لئے، دئیے، کئے لکھنا غلط ہے۔ صحیح ہے: لیے، دیے، کیے۔ مدیر)

*طاقت وَر، دانش وَر، نام وَر

*کام یاب، کم یاب، فتح یاب، صحت یاب

*گم نام، گم شدہ

*خوش گوار، خوش شکل

*الم ناک، وحشت ناک، خوف ناک، دہشت ناک، کرب ناک

*صحت مند، عقل مند، دانش مند،

*شان دار، جان دار، کاٹ دار،

*اَن مول، اَن جانا، اَن مٹ، اَن دیکھا، اَن چُھوا

*بے وقوف، بے جان، بے کار، بے خیال، بے فکر، بے ہودہ، بے دل، بے شرم، بے نام،

*امرت سر، کتاب چہ

*خوب صورت، خوب سیرت وغیرہ

دوسری:

اردو لکھتے ہوئے ہمیں یکساں آواز مگر مختلف املا کے الفاظ کا خیال رکھنا چاہیے، جیسے کہ کے اور کہ، سہی اور صحیح، صدا اور سدا، نذر اور نظر، ہامی اور حامی، سورت اور صورت، معرکہ اور مارکہ، قاری اور کاری، جانا اور جاناں وغیرہ

تیسری:

اردو کا اہم ذخیرہ الفاظ فارسی کے علاوہ عربی کے الفاظ پر بھی مشتمل ہے، جس میں بہت سی تراکیب بھی عربی کی ہیں، ان کو لکھتے ہوئے ان کے املا کا خیال رکھنا چاہیے، جس میں بعض اوقات الف خاموش (سائلنٹ) ہوتا ہے جیسے بالکل، بالخصوص، بالفرض، بالغرض وغیرہ۔ جب کہ کہیں چھوٹی 'ی' یا کسی اور لفظ پر کھڑی زبر ہوتی ہے، جو الف کی آواز دیتی ہے، جیسے وزیر اعلیٰ، رحمٰن اور اسحٰق وغیرہ، اسی طرح بہت سی عربی تراکیب میں 'ل' ساکت ہوتا ہے جیسے 'السلام علیکم'۔ اسے 'ل' کے بغیر لکھنا فاش غلطی ہے۔

چوتھی:

زیر والے مرکب الفاظ جیسے جانِ من (نہ کہ جانے من) جانِ جاں (نہ کہ جانے جاں) شانِ کراچی (نہ کہ شانے کراچی) فخرِ پنجاب (نہ کہ فخرے پنجاب)، اہلِ محلہ نہ کہ (اہلے محلہ) وغیرہ کی غلطی بھی درست کرنا ضروری ہے۔

پانچویں:

اپنے جملوں میں مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے 'کر دینا ہے' نہیں بلکہ 'کر دیں گے' لکھنا چاہیے، جیسے اب تم آ گئے ہو تو تم بول بول کے میرے سر میں درد کر دو گے (نہ کہ کر دینا ہے) اب ٹیچر آ گئے

ہیں توتم کتاب کھول کر پڑھنے کی اداکاری شروع کردو گے (نہ کہ کردینی ہے) لکھنا چاہیے۔

چھٹی:

اردو کے ’مہمل الفاظ‘ میں ’ش‘ کا نہیں بلکہ ’و‘ کا استعمال کیا جاتا ہے، جیسے کتاب وتاب، کلاس ولاس، اسکول وسکول، پڑھائی وڑھائی، عادت وادت وغیرہ۔ انہیں کتاب شتاب، کلاس شلاس لکھنا غلط ہے۔

ساتویں:

اردو میں دوزبر یعنی ’تنوین‘ والے لفظوں کو درست لکھنا چاہیے، اس میں دوزبر بدل کر ’ن‘ کی آواز دیتے ہیں جیسے تقریباً، اندازاً، عادتاً، اصلاً، نسلاً، ظاہراً، مزاجاً وغیرہ۔

آٹھویں:

کسی بھی لفظ کے املا میں ’ن‘ اور ’ب‘ جہاں ملتے ہیں وہاں ’م‘ کی آواز آتی ہے، اس کا بالخصوص خیال رکھنا چاہیے۔ ’ن‘ اور ’ب‘ ہی لکھا جائے ’م‘ نہ لکھا جائے، جیسے انبار، منبر، انبوہ، انبالہ، استنبول، انبیا، سنبھل، سنبھال، اچنبھا، عنبرین، سنبل وغیرہ

نویں:

اردو کے ان الفاظ کی درستی ملحوظ رکھنا چاہیے جو "الف" کی آواز دیتے ہیں، لیکن کسی کے آخر میں ’ہ‘ ہے اور کسی کے آخر میں الف۔ انہیں لکھتے ہوئے غلطی کی جائے، تو اس کے معانی میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے گلہ اور گلا، پیسہ اور پیسا، زن اور ظن، دانہ اور دانا وغیرہ وغیرہ۔

دسویں:

الف کی آواز پر ختم ہونے والے الفاظ چاہے وہ گول ’ہ‘ پر ختم ہوں یا ’الف‘ پر، انہیں جملے میں استعمال کرتے ہوئے بعض اوقات جملے کی ضرورت کے تحت ’جمع‘ کے طور پر لکھا جاتا ہے، حالاں کہ وہ واحد ہی ہوتے ہیں۔ ایسے میں جملے کا پچھلا حصہ یا اس سے پہلے والا جملہ یہ بتا رہا ہوتا ہے کہ یہ دراصل ’ایک‘ ہی چیز کا ذکر ہے۔ جیسے:

_ میرے پاس ایک ’بکرا‘ تھا، اس ’بکرے‘ کا رنگ کالا تھا۔

_ میرے پاس ایک ’چوزا‘ تھا، ’چوزے‘ کے پر بہت خوب صورت تھے۔ (باقی صفحہ ۳۰ پر)

نسیاً منسیاً کی کہانی: مولانا عامر عثمانی

عبداللہ زکریا فلاحی

اگر مولانا عامر عثمانی ''مسجد سے میخانے تک'' کے علاوہ زندگی میں اور کچھ بھی نہیں لکھتے تو بھی وہ ادب میں ہمیشہ زندہ رہتے۔ ملا ابن العرب مکی کے نام سے لکھے گئے یہ کالم یہ ایک شاہکار ہیں اور اس پائے کا طنز شاید ہی کبھی اور لکھا گیا ہو۔ (اس کے محاسن گنوانے کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے) اس طنز کو میں ''مومنانہ'' طنز سے تعبیر کروں گا۔ طنز سے یقیناً ایک سطح پر سماج کی برائیوں کو اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن یہ کبھی بھی کسی خاص فلسفہ کے تحت نہیں لکھا جاتا ہے جب کہ ''مسجد سے میخانے تک'' میں جو طنز ہے، وہ سراسر جماعت اسلامی کے فلسفہ کی دفاع کی ایک کوشش ہے اور اسی کے پیشِ نظر لکھا گیا ہے۔ یہ کوشش کوئی بھی فرد جو جماعت سے منسلک تھا اور ادبی ذوق رکھتا تھا کر سکتا تھا لیکن عامر عثمانی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس کی ادبی حیثیت ذرا بھی مجروح نہیں ہونے دی۔ اچھا طنز لکھنا ویسے بھی دنیا کا مشکل ترین کام ہے چہ جائے کہ وہ کسی خاص نظریے کے تحت لکھا جائے۔ ''طنز و مزاح بومرینگ boomerang کی طرح ہوتا ہے۔ وار اوچھا پڑ جائے تو پلٹ کر خود شکاری کو شکار کر لیتا ہے'' یہ جملہ طنز و مزاح کے سرخیل مشتاق احمد یوسفی کا ہے۔ ''مسجد سے میخانے تک'' کا طنز اعلیٰ ترین قسم کا طنز ہے۔ عامر عثمانی چونکہ گونا گوں صلاحیتوں کے حامل تھے، اس لیے ان کی شخصیت کی کئی جہتیں نمایاں نہ ہو سکیں جس میں بطور خاص انکی شاعری کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ اسلامی ادب کے تحت جو شاعری کی گئی، اسمیں ماہر القادری، نعیم صدیقی، حفیظ میرٹھی، ابوالمجاہد زاہد جیسے کچھ ناموں کو چھوڑ دیں تو اسے معیاری شاعری نہیں کہا جا سکتا ہے۔ بات تلخ ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس شاعری کے تحت جو کچھ لکھا گیا اس میں ''شعریت'' کے علاوہ سب کچھ ہے۔ عامر عثمانی کی شاعری کو اگر ہم شاعری کے سب سے اعلیٰ معیار سے بھی ناپیں تو وہ انگریزی محاورے کے مطابق (flying colours) سے پاس ہوتی ہے۔

مولانا مطلوب الرحمن کے گھر 1920 میں ایک فرزند امیر الرحمن تولد ہوتا ہے جو بعد میں عامر عثمانی کے نام سے مشہور ہوتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرتا ہے اور کسبِ معاش کے سلسلہ میں'' پرچون

فروشی'' سے لے کر'' پتنگ فروشی'' تک کے مراحل سے گزرتا ہے لیکن کامیابی نہیں ملتی ہے۔ خدا کی مشیت کچھ اور تھی، سو کامیابی کیسے ملتی۔ ایک دن ہر طرف سے تھک کر'' تجلی'' نام کا ایک ماہنامہ شروع کرتا ہے اور پھر وہ جو کہتے ہیں نا کہ rest is history تو ایسی کامیابی ملتی ہے کہ دنیا دیکھتی رہ جاتی ہے۔

ان میں شاعری کی صلاحیت فطرت کی طرف سے ودیعت کی ہوئی تھی اس لیے وہ گونا گوں مصروفیت کے باوجود اس کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ جگر مراد آبادی سے متاثر تھے اس لیے ان کے یہاں بھی وہی سرشاری اور جذب و مستی کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ بہت لوگوں کو یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ وہ گھوم گھوم کر مشاعرے بھی پڑھتے تھے لیکن وہ زاہدِ خشک نہیں تھے۔ بیان کرنے والے تو یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ ان کے مشاغل میں ہر شام دیوبند کی ایک سوڈے کی دوکان پر بیٹھ کر سوڈا پینا اور گپ شپ کرنا بھی شامل تھا۔ پتنگ بازی کا بھی شوق رکھتے تھے۔ کبوتر بازوں سے بھی تعلقات تھے اور وہ ان سے گھنٹوں کبوتروں کی مختلف اقسام کے تعلق سے باتیں کرتے تھے۔ محلے کے بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے بھی دیکھے جاتے تھے۔ ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ اس طرح کے مشاغل کے بغیر انسان، انسان نہیں بنتا ہے لیکن شخصیت اکہری ضرور رہ جاتی ہے۔

ان کا مجموعہ کلام'' یہ قدم قدم بلائیں'' کے نام سے چھپا ہے اور اس کو پڑھ کر جسم میں سرور و انبساط کی لہریں بہنے لگتی ہیں۔ یہ ایک اعلی درجہ کی شاعری ہے اور گو کہ ایک خاص نظریے کے تحت کی گئی ہے لیکن روح شاعری پر ذرہ برابر بھی آنچ نہیں آئی ہے۔ اصلاحی اور اسلامی شاعری میں'' شعریت'' کو برقرار رکھنا کتنا مشکل ہے، اس کی عبرتناک مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ خود ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو شاعری کی گئی اور اس کا جو حشر ہوا، ہم اس سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ عامر عثمانی نے کوشش کی ان کی شاعری شاعری ہی رہے، پروپیگنڈہ نہ بن جائے۔ جب وہ اسلامی فلسفہ کو بھی موضوع بناتے ہیں، تب بھی اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ'' شاعرانہ'' ہی رہے:

یہ کم نہیں کہ بجھائی ہے پیاس کانٹوں کی
بلا سے راہِ وفا میں لہولہان ہوئے

اگر ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ اس کا خالق کون ہے تو ہم اسے فیض یا کسی اور بڑے شاعر کا شعر سمجھ کر پڑھیں گے اور

سر دُھنیں گے۔ بات وہی راہِ وفا میں قربانی دینے کی کہی جا رہی ہے لیکن نظریہ خالصتاً اسلامی ہے۔ یا پھر مجموعہ کی سب سے پہلی غزل دیکھیں جس کے ایک شعر سے اس مجموعہ کا نام ماخوذ ہے۔

نہ سکت ہے ضبطِ غم کی، نہ مجالِ اشکباری
یہ عجیب کیفیت ہے، نہ سکوں نہ بے قراری
ترا ایک ہی ستم ہے، ترے ہر کرم پہ بھاری
غمِ دو جہاں سے دے دی، مجھے تونے رستگاری
یہ قدم قدم بلائیں، یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے، جسے زندگی ہو پیاری
مری صبح منتظر ہے، کسی اور صبحِ نو کی
یہ سحر تجھے مبارک، جو ہے ظلمتوں کی ماری
وہی پھول چاک دامن، وہی رنگِ اہلِ گلشن
ابھی صرف یہ ہوا ہے کہ بدل گئے شکاری
مری عافیت کے دشمن، مجھے چین آچلا ہے
کوئی اور زخمِ تازہ،ک وئی اور ضربِ کاری
مجھے لے چلا بہا کر، غمِ زندگی کا دھارا
غمِ عشق یاوری کر، ہے مقامِ شرمساری

بندش کی چستی، خیال آفرینی، استعاروں کا استعمال، الفاظ کا حسنِ انتخاب اور خیال کا ابلاغ اور ترسیل، غرض کہ اچھی شاعری کے لیے جو بھی عوامل درکار ہوتے ہیں، یہ غزل ان کا ایک حسین مرقع ہے اور یہ کوئی استثنا نہیں ہے بلکہ اگر ان کے پورے کلام کا جائزہ لیا جائے تو یہی پختگی اور شعریت آپ کو تقریباً ہر مقام پر دکھائی دے گی۔ ذرا یہ اشعار دیکھیے کہ کیسے ان میں ان کا کمالِ فن بول رہا ہے

چشمِ باطن کو بروئے کار جب لاتا ہوں میں
وہ کہیں بھی ہوں،نظر کے سامنے پاتا ہوں میں

فکرِ دنیا ہو، غمِ عقبیٰ ہو، دردِ عشق ہو
غم کا ہر نغمہ ربابِ عشق پر گاتا ہوں میں
مرحبا اے کوششِ ضبطِ مسلسل مرحبا
آج ان کو آرزو مندِ فغاں پاتا ہوں میں

یا پھر ان اشعار میں جو بلا کا سوز اسے محسوس کرنے کی کوشش کیجیے:

موسمِ گل کو کیا کریں، دل میں شگفتگی نہیں
فرصتِ زندگی تو ہے، خواہشِ زندگی نہیں
غم کے سرورِ خاص کا، جس کا شعور ہی نہیں
عشق کے کاروبار میں، اس کے لیے خوشی نہیں
تیری نگاہِ ناز کی، چارہ گری کو کیا کہوں
درد میں کچھ کمی بھی ہے، اور کوئی کمی نہیں

وہ جگر سے بہت متاثر تھے۔اس غزل میں اسی جذب اور سرمستی کے دریا کو بہتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے جو جگر کی پہچان ہے:

یہ قدم قدم اسیری، یہ حسین قید خانہ
کوئی طاق ہے نہ بیڑی،ک وئی دام ہے نہ دانہ
مرے زخم بھر نہ جائیں، مجھے چین آنہ جائے
یہ کبھی کبھی توجہ، ہے ستم کا شاخسانہ
یہ سمجھ کے اس نے بخشی، کبھی دولتِ سکوں بھی
کہیں راس آنہ جائے، مجھے گردشِ زمانہ
وہ کہیں جہاں پہ عامر، مجھے چھوڑ کر گئے تھے
ہے رکی ہوئی ابھی تک، وہیں گردشِ زمانہ

اچھی شاعری وہی مانی جاتی ہے جہاں بات اشاروں، کنایوں میں کی جائے،، پیکر خیال کو استعاروں کا لبادہ

پہنایا جائے ، بات کچھ مبہم بھی ہو اور اس کے کئی معنی نکل سکتے ہوں، انھوں نے ان مروجہ اصولوں سے کئی جگہ انحراف بھی کیا ہے، ان کے یہاں بہت سارے اشعار ایسے بھی ملتے ہیں، جہاں ان کا مطمح نظر ڈھکا چھپا نہیں بلکہ بالکل عیاں ہے لیکن وہاں بھی انھوں نے شاعری کے دامن کو نہیں چھوڑا ہے

ہزاروں طاق سجے، سیکڑوں چراغ جلے
ہماری رات کے سائے مگر ذرا نہ ڈھلے
تمام عمر گزاری ہوس کے سائے میں
اجل کا وقت جو آیا تو ہم نے ہاتھ ملے
بتوں کے در سے عطا ہو جو عزت و حشمت
ہم ایسی عزت و حشمت سے دور دور چلے
حرم کے حق میں ہیں وہ مارِ آستیں عامر
دل و دماغ جو بچپن سے میکدے میں پلے

یا پھر اس طرح کے اشعار:

مجاہدو اس کو یاد رکھنا، یہ ایک نکتہ ہے عارفانہ
جہادِ حق کارگر نہ ہوگا، اگر نہیں گریۂ شبانہ
عروج سے بہرہ ور نہ ہوگی، کبھی حیاتِ منافقانہ
زباں پہ اسلام کا وظیفہ، مگر خیالات کافرانہ
ستیزہ گاہِ عمل سے عامر، جو کنج عزلت میں لا بٹھائے
وہ زہد ہے یاس و بزدلی کو، ج واز دینے کا اک بہانہ

پھر ایک خاص رنگ کے زہد وتقشّف اور مشرکانہ رسوم پر ان کا طنز

نغمہ ولے کے متوالوں کو، صاحبِ وجد وحال تو دیکھا
لیکن ان ''خاصانِ خدا'' سے، رزم کے میداں خالی پائے
فضلِ خدا سے رشتہ توڑے، شرکِ جلی سے ناطہ جوڑے

دیر سے بیٹھا ہے اک صوفی،قبرِ ولی پر آس لگائے
قبروں پر جب میلے دیکھے،تب یہ بات سمجھ میں آئی
بن جاتے ہیں ناداں انساں،کتنی آسانی سے چوپائے

انھوں نے غزلوں کے ساتھ نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور وہاں بھی وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔''اے کہ تو'' اور ''روداِدِالم'' میں وہ جس طرح سے سرورِکائنات ﷺ سے مخاطب ہیں اور جس طرح سے اپنی اور امت کی تہی دامنی کا نوحہ کرتے ہیں وہ دلوں کی چیر دیتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے ذخیرہ نظم میں ''خواب اور تعبیر''، ''ہائے یہ گردشِ دوراں''، ''پیغام''، ''سرخ ستارہ''، ''بغاوت''، ''سحر ہو بھی چکی''، ''قافلہ حجاج سے خطاب'' جیسی نظمیں ہیں جوان کے کمالِ فن کی آئینہ دار ہیں،لیکن ان کی سب سے مشہور نظم ''خواب جو بکھر گئے'' ہے۔یہ نظم ویسے بھی ایک شاہکار ہے لیکن اسے اس بات نے اور بھی خاص بنا دیا ہے کہ پونے کے مشاعرے میں یہ نظم سنانے کے دس منٹ کے بعد اسٹیج پر انھیں قلب کا شدید دورہ پڑا اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔نظم بہت طویل ہے لیکن اس لائق ہے اس کے کچھ بند نقل کر دیے جائیں:

جنھیں سحر نگل گئی،وہ خواب ڈھونڈھتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی،شراب ڈھونڈھتا ہوں میں
مجھے نمک کی کان میں مٹھاس کی تلاش ہے
برہنگی کے شہر میں لباس کی تلاش ہے
وہ برف باریاں ہوئیں کہ پیاس خود ہی بجھ گئی
میں ساغروں کو کیا کروں کہ پیاس تلاش ہے
گھرا ہوا ہے ابر ماہتاب ڈھونڈھتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈھتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈھتا ہوں میں
یہ دھوپ زرد زرد سی،یہ چاندنی دھواں دھواں
یہ طلعتیں بجھی بجھی،یہ داغ داغ کہکشاں

یہ سرخ سرخ پھول ہیں کہ زخم ہیں بہار کے
یہ اوس کی پھوار ہیں کہ رو رہا ہے آسماں
دل و نظر کے موتیوں کی آب ڈھونڈھتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈھتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈھتا ہوں میں

اور نظم کا یہ آخری بند:

بہت دنوں میں راستہ، حریمِ ناز کا ملا
مگر حریمِ ناز تک پہونچ گئے تو کیا ملا
مرے سفر کے ساتھیو! تمہیں سے پوچھتا ہوں میں
بتاؤ کیا صنم ملے، بتاؤ کیا خدا ملا
جواب چاہیے مجھے، جواب ڈھونڈھتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈھتا ہوں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈھتا ہوں میں

افسوس کہ اس آفتاب کو وہ گہن لگا اور اس کے خوابوں کو وہ سحر نگل گئی کہ اردو کے جغادری ادیبوں اور نقادوں کو چھوڑیے کہ وہ ''فکر اسلامی'' سے الرجک ہیں اور اپنے خود ساختہ پیمانوں پر شاعری کے حسن و قبح کو ناپتے ہیں، رونا اس بات کا ہے کہ اصلاحی اور تعمیری ادب کے علمبردار اور نقیب تک اس البیلے شاعر کی عظمت سے کماحقہ واقف نہیں ہیں (میرے علم کی حدیں بہت محدود ہیں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ان کی بازیافت کی یا ان کی عظمت کو اجاگر کرنے کی آج تک کوئی سنجیدہ کوشش ہوئی ہے) ورنہ یہ شعر کہنا والا شخص

ہمیں آخرت میں عامر، وہی عمر کام آئی
جسے سب سمجھ رہے تھے، غمِ عشق میں گنوائی

ہمارے دل و دماغ میں آج بھی زندہ ہوتا۔

ڈاکٹر خورشید عالم

نظروں سے اوجھل دلوں کا مکیں

ڈاکٹر محمد طارق احسن فلاحی

لاکھوں کروڑوں چشم ہوئیں آج اشکبار اک دردمند، قوم کا مسیحا چلا گیا

دوشنبہ، دس مئی ۲۰۲۱ کی ابتدائی شب کو انتہائی افسوس کے ساتھ یہ خبر ملی کہ غریبوں کے مسیحا عالم بھیا نے دنیا کے اس مسافر خانے کو خیرباد کہہ دیا۔ بابرکت ماہ، مغفرت کی رات، ستائیسواں رمضان المبارک۔ اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے اس سے زیادہ سعادت کی گھڑی کیا ہوگی- اللہ تعالی اپنے برگزیدہ بندوں اور پاک نفوس کو ایسی ہی سعادتوں سے نوازتا ہے۔

(كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ) ہر نفس کو موت سے دو چار ہونا ہے، یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی جدائی کو عرصے تک محسوس کیا جاتا ہے اوران کا اس دنیا سے الفراق کہہ دینا نہ صرف اہل خانہ بلکہ پورے سماج کے لیے باعث رنج والم بن جاتا ہے۔ عالم بھیا بھی انھیں شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ ایک درویش صفت انسان کا دنیا سے چلے جانا یقیناً رنج والم کا باعث ہے۔ ان کی رحلت کا سانحہ ایک عظیم اور ناقابل تلافی سانحہ ہے جسے بلاتفرق مذہب وملت پورے علاقے کے ہر مرد وزن، بچے و بزرگ نے یکساں محسوس کیا۔ اپنے بے شمار شیدائیوں کو روتا بلکتا، محزون اور نم دیدہ چھوڑ کر وہ اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی رحلت کے بعد ان کے عقیدت مند کہتے ہیں کہ وہ ایک بہت بڑے انسان تھے۔ ان کے دست شفا سے فیض یاب ہونے والے کہتے ہیں کہ وہ ایک بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ ڈاکٹر بڑے تھے یا انسان بڑے تھے۔ مگر میرے نزدیک وہ ڈاکٹر بھی بڑے تھے اور انسان بھی بڑے۔ کیونکہ عوام میں ان کی مقبولیت ان کی طب میں مہارت کے ساتھ ساتھ کردار کی عظمت کی وجہ سے تھی۔

عالم بھیا علم وفضل کے اعتبار سے اعلی مقام پر فائز تھے۔ اپنے فن اور موضوع کے آفتاب اور ماہ تاب تھے۔

بے پناہ صلاحیتوں کے مالک، سادگی کے پیکر، انکساری ان کی فطرت، حسن اخلاق، ہمدردی اور دل سوزی ان کی شناخت، نہ دولت کا گھمنڈ نہ پیسے کا لالچ۔ کبر وغرور سے کوسوں دور۔ ایک نہایت شریف اور بے ریا انسان۔ ایک غیر متنازع شخصیت کے مالک۔ ہر ایک کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا ان کی خاص عادت تھی۔ اللہ کے بندوں کی بلاتفریق (ہندو یا مسلم) خدمت کا جذبہ، قرابت داری، سماجی مسائل میں دلچسپی، دینی امور میں تعاون، اہل علم حضرات کا احترام، سخاوت اور فیاضی، ضیافت اور مہمان نوازی، حق گوئی اور بے باکی ان جیسی بہت ساری خوبیاں ان کے کردار کا اہم حصہ تھیں۔ کتنے نادار طلبہ کی کفالت کرتے تھے کبھی اس کا اشتہار نہیں کیا۔

دولت خدا نے بخشی تو حق بھی ادا کیا　کہرام مچ گیا ہے مہرباں چلا گیا

عالم بھیا کی زندگی ہمہ جہت تھی۔ دینی شعور کے ساتھ عملی شہادت نے ان کی شخصیت کو حسین و دل کش بنا دیا تھا۔ ان کے کردار پر اپنے والد حکیم محمد ایوب رحمۃ اللہ کا زبردست اثر تھا اور ان کے خلا کو کچھ حد تک پر کر رہے تھے۔ وہ اپنے پانچ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان سے بڑی دو بہنیں ہیں۔ چھوٹے بھائیوں سے ہمیشہ شفقت کا سلوک کیا۔ بہنوں کا ہمیشہ احترام کیا۔ شاید ہی کبھی بھائیوں اور بہنوں میں تلخی ہوئی ہو۔ شاید ہی کبھی کسی کا دل دکھایا ہو۔ سب کے ہر دلعزیز تھے گھر کے سبھی بچے ان کے قریب اور ان سے بے تکلف تھے۔ عمر کے لحاظ سے بڑی شگفتہ مزاجی سے حسب مراتب علمی اور تفریحی گفتگو کرتے۔ قرابت داری کا بہت پاس تھا۔ کسی رشتہ داری میں خوشی یا غم کا موقع ہوتا تو وقت نکال کر ضرور پہنچ جاتے۔ مطالعے کا بہت شوق تھا۔ ان کے مطالعے کا میدان بہت وسیع تھا۔ ان کا مطالعہ صرف طب تک محدود نہیں تھا۔ اردو و انگریزی میں تاریخی، سوانحی، دینی و ادبی کتب، جرائد و رسائل کا مطالعہ کرنا ان کا مشغلہ و ذوق تھا۔ عالم بھیا بہت مہمان نواز تھے۔ ساتھ ہی سادگی اور انکساری بھی تھی۔ ان کی سادگی کا یہ حال تھا کہ اپنے مہمانوں کے لیے افراد خانہ کو چائے بنانے کی زحمت نہیں دینا چاہتے اور خود ہی کھانے پینے کے لوازمات مہمان کے سامنے لا کر پیش کر دیتے تھے۔ حالانکہ گھر کے سبھی افراد مہمانوں کی خاطر و مدارات و ضیافت کے لیے بڑی خوشدلی سے ہر وقت مستعد رہتے تھے لیکن وہ کسی سے کہنے میں تکلف کرتے۔ ادھر کئی سالوں سے گھر والوں کے بہت اصرار پر کسی مہمان کی آمد پر اپنی بھانجی اور چھوٹے بھائی کی بہو زینب سلمہا سے نہایت انکساری

سے کہتے: 'چائے مل سکتی ہے کیا؟'

عالم بھیا نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ مظفر پور بہار کے میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔ ان کا تعلیمی دور بڑی شان وشوکت سے گزرا۔ جس کا رشتہ داروں اور دوستوں میں بڑا چرچا ہوا کرتا تھا لیکن عملی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد ان کا طرز زندگی بالکل زاہدانہ ہو گیا۔ سادہ شرٹ پتلون، عام سے جوتے، کندھے پر بیگ لٹکائے ہوئے اسکوٹر سے چلنا، اعظم گڑھ جانے کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ یا عام سواریوں کا استعمال کرنا۔ جو انھوں نے صحیح سمجھا اس پر عمل کیا کسی کے کہنے کی کوئی پروا نہیں کی۔ گھومنے کے بہت شوقین تھے۔ سال میں وقفے وقفے سے باہر نکل جاتے۔ حج وعمرہ کے فرائض کی ادائیگی بھی کی اور دیگر مشہور مقامات کا سفر کیا۔ بہترین مقامات کی تصویر موبائل پر لیتے اور فیس بک پر پوسٹ کرتے رہتے۔

عالم بھیا کو اپنے فن میں بہت مہارت حاصل تھی۔ علاج کے ساتھ ساتھ مریض کی ضرورتوں اور نفسیات کا خاص خیال رکھتے۔ ہر مریض کو صحیح مشورہ دیتے۔ اگر دوا کی ضرورت ہوتی تو دوا لکھتے ورنہ صاف کہہ دیتے کہ اب آپ کو دوا کی ضرورت نہیں رہی۔ بسا اوقات مریض یہ سن کر حیرت سے ان کا منہ دیکھتے۔ ہمیشہ یہی کوشش کرتے کہ مریض زیر بار نہ ہوں۔ دوائیں سستی اور موثر ہوں۔ زیادہ ٹسٹ وغیرہ سے گریز کرتے۔ مریضوں سے ان کے گھر کے لوگوں کی خیریت دریافت کرتے۔ مریضوں کی صرف مسیحائی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ مریض ان کی مربیانہ اور مشفقانہ شخصیت سے مستفید ہو رہے ہوتے۔ ان کو اپنا پرسنل نمبر دیتے کہ جب ضرورت پڑے فون کر لیں۔ ان کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی مریض فون کرتا تو اس کا پورا حلیہ بتاتے کہ اچھا تم ہو نا ایسا ایسا حلیہ۔ مریض ان کا بے حد احترام کرتے اور دل سے قدر کرتے۔ انھیں آتا دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو جاتے۔

عالم بھیا نے اپنے بچوں کی بہترین تربیت کی انھیں اعلی تعلیم دلائی اور خود ایک کامیاب زندگی بسر کی- عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ گھر سے باہر دوسروں کے لیے بڑے مخلص، نیک، سخی، ہم درد وغمگسار ہوتے ہیں لیکن اپنے گھروں کے اندر اور خاندان کے لوگوں کے لیے ان کا رویہ اس کے برعکس اور متضاد ہوتا ہے- لیکن ہم عالم بھیا کی شخصیت کو اس اعتبار سے بھی مثالی پاتے ہیں- اللہ تعالی نے انھیں صالح اور فرمانبردار اولاد بطور انعام نوازا- فرزند ڈاکٹر یاسر خان اپنے والدین کے بے حد قدر داں، جیسے ہی ان کی

بیماری کا سنا پہلی فرصت میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر ممبئی سے اعظم گڑھ کا رخ کیا- اور رہائش گاہ ہی پر ایک اسپتال کی ساری سہولیات مہیا کردیں اور علاج معالجے میں کسی قسم کی کوئی کسر نہیں چھوڑی،لیکن اجل کا ایک وقت معین ہے جس کے سامنے ہر کوئی بے بس ہے۔

میری عالم بھیا سے بچپن ہی سے دینی،فکری اور روحانی وابستگی رہی تھی۔اور وہ بھی مجھے ممبئی سکونت پذیر ہونے کے باوجود ہمیشہ شادی بیاہ،خوشی اور غمی ہر موقع پر بڑے خلوص کے ساتھ ضرور یاد کرتے۔جب بھی میں ان سے ملنے جاتا تو پورے گھر کی فرداً فرداً خیریت پوچھتے خصوصاً میرے بچوں کی پڑھائی کے بارے میں ضرور پوچھتے اور ان کی پڑھائی کے بارے میں سن کر اپنی دلی خوشی کا اظہار کرتے اور ہر ملاقات پر یہ ضرور کہتے آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنے بچوں کو بھی لے کر چلے گئے ورنہ بلریا گنج گاؤں کا ماحول انھیں اتنی اچھی طرح اعلی پڑھائی پڑھنے نہیں دیتا اور نہ اتنے مہذب ہو پاتے۔

دنیا میں دو چیزیں ایسی ہیں جن کا صرف دیکھنا عبادت ہے:ایک خانہ کعبہ کا طواف کے بغیر محض دیکھنا عبادت ہے۔دوسرے بوڑھے والدین کو محبت بھری نگاہ سے دیکھنا۔عالم بھیا کو اپنے والدین سے بے حد عقیدت تھی اور ساتھ ہی دوسروں کے والدین کا بھی بے حد احترام کرتے۔کوئی امیر ہو یا غریب،اگر آ کر عالم بھیا سے کہہ دیتا کہ اماں یا ابا بیمار ہیں گھر چل کر دیکھ لیجیے تو وہ احساس برتری کے تاج کو پھینک کر عاجزی کی چادر اوڑھ کر فرصت نکال کر اس کے گھر ضرور چلے جاتے۔آج کے دور میں یہ تصور بھی محال ہے۔اکثر ڈاکٹر حضرات گھر جا کر مریض دیکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ایک دن ہماری والدہ صاحبہ ان کو دکھانے چلی گئیں تو انھیں آتا دیکھ کر کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے چچی جان آپ اتنی زحمت اٹھا کر کیوں آئیں آپ جب بھی بیمار ہوں کسی بچے سے کہلوا دیا کریں۔میں خود آ کر دیکھ لیا کروں گا۔واضح رہے کہ ان کا مطب ہمارے گھر سے صرف دو قدم کی دوری پر واقع ہے۔بیس سال قبل ہمارے والد صاحب محترم ماسٹر جنید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد محض برادرانہ شفقت سے مجھ سے کہا کہ آپ ممبئی جاتے وقت چچی (ہماری والدہ) سے کہہ دیجیے گا کہ سامان کی لسٹ اور جھولا میرے پاس بھیج دیا کریں گی میں خریداری کرا دیا کروں گا۔کیونکہ آپ کے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔

وقت گر ساتھ دے کردار میں زندہ رہیے　　　محض بیکار ہے تصویر میں زندہ رہنا

اسی کی دہائی کی آخری برسوں میں جب ہماری اہلیہ کی دادی اماں بستر مرگ پر تھیں تو عالم بھیا روزانہ صبح وشام ان کو دیکھنے کے لیے نصیر پور جایا کرتے تھے اور دادی کی عیادت وعلاج کے ساتھ ساتھ اہلیہ کے والد کو بھی دلاسہ دلاتے اور مورل سپورٹ کرتے۔ ہماری اہلیہ کے والد محترم (جناب خورشید عالم خان مرحوم صاحب رح نصیر پور) جو اپنے علاقے کی بہت مشہور ومعروف شخصیت تھے، ہندو مسلم ہر طبقے میں یکساں انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علاقے کی بڑی سے بڑی پنچایت کے حکم ہوا کرتے تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے انداز میں بے باکانہ سب کے مسائل کی گتھیاں سلجھایا کرتے تھے۔ انھوں نے تقریبا چودہ سال کی عمر میں سایہ پدری سے محروم ہونے کے بعد اپنے چھوٹے بہن اور بھائیوں کو بڑے خلوص کے ساتھ خون جگر سے سینچ کر انھیں اونچے اونچے عہدے پر پہنچانے میں اہم کردار کیا۔ لیکن ان کی اپنی زندگی میں جب مسائل پیش آئے اور ان کو کسی جانب سے خاطر خواہ تعاون نہ ملا تو وہ اپنی تمام مضبوط قوت ارادی اور ہمت کے باوجود احساس تنہائی کی وجہ سے نفسیاتی مرض اور اختلاج قلب کا شکار ہو گئے۔ ان کی بیماری کے ایام میں عالم بھیا روزانہ نصیر پور جا کر گھنٹوں ان کے پاس بیٹھتے، تسلی دیتے، ڈھارس بندھاتے اور ان کے مزاج کے مطابق تاریخی اور ادبی باتیں کرتے اور اپنی خودنمائی اور خودستائی پر مبنی کبھی ایک لفظ نہیں بولتے تھے، حتی الامکان ایک کپ چائے پینے سے بھی احتراز کرتے تھے۔ بلاشبہ ایسے اعمال جن میں خلوص کی شیرینی ہوتی ہے ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ انھی ایام میں ایک دن عالم بھیا نے بہت پرشوق لہجہ میں ان سے پوچھا کہ مشہور ضرب المثل ٹیڑھی کھیر کی حقیقت کیا ہے۔ جس پر انھوں نے لہک لہک کر اپنے منفرد لہجے میں ایکشن کے ساتھ اس دلچسپ واقعے کی وضاحت فرمائی۔ ''مشہور ہے کہ ایک شاگرد نے اپنے استاد کی دعوت دی اور کہا کہ آج میں آپ کو کھیر کھلاؤں گا۔'' استاد محترم تھے نابینا، انھوں نے کبھی کھیر کھائی نہیں تھی، اس لیے شاگرد سے پوچھا: ''بھئی کھیر کیسی ہوتی ہے؟'' شاگرد نے جواب دیا: ''سفید ہوتی ہے۔'' استاد نے پوچھا: ''بھئی سفید کیسا ہوتا ہے؟'' شاگرد نے کہا جیسے بگلا، لیکن استاد صاحب نے بدقسمتی سے بگلا بھی نہیں دیکھا تھا اس لیے پ پوچھا: ''بھئی بگلا کیسا ہوتا ہے'' شاگرد نے اپنا ہاتھ ٹیڑھا کر کے بگلے کی صورت بنائی، استاد نے چھو کر دیکھا اور سادگی سے فرمایا: ''یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اسے کیسے کھاؤں گا۔'' عالم بھیا سن کر باغ باغ ہو گئے اور کہا آپ نے بہت بہترین وضاحت فرمائی۔

عالم بھیا غضب کے مردم شناس تھے۔ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ کسی کے تعلق سے جلد اپنی رائے قائم نہیں کرتے تھے اور جب کسی کے بارے میں رائے رکھتے تو وہ ان کی رائے کے متضاد نہیں نکلتا۔ ان کے پاس بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے سے یہ احساس ہوتا تھا کہ ہم کسی ولی اللہ اور مرشد کامل کی صحبت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ان کا مشورہ بہت ہی مناسب اور درست ہوتا۔ ایک مرتبہ مجھے مشورہ دیا کہ ممبئی جیسے شہر میں ماہر ایلوپیتھ تو بہت مل جائیں گے۔ آپ یونانی میڈیسن میں MD ہیں اگر آپ کو ایک Paracetamol بھی لکھنا ہو تب بھی آپ مت لکھیں، آپ یونانی ہی دوا لکھیں اور اسی میں اپنی شناخت بنائیں۔ الحمدللہ آج میں ان کے مخلصانہ مشورے پر عمل کر کے بہت ہی مطمئن ہوں اور دلی خوشی محسوس کرتا ہوں۔ ایک مشورہ انھوں نے یہ دیا کہ ہاں آپ میری طرح Simple مت رہیے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اس مشورے کو نہ مان کر ان کی جیسی سادگی اپنانے کی کوشش کروں، لیکن ان کے جیسی سادہ زندگی گزارنا آسان نہیں ہے۔

گزشتہ سال اکتوبر میں جب میں نے وطن کا سفر کیا اس وقت کرونا کے قہر اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے ان کا کہیں آنا جانا کم تھا۔ میں اس وقت ایک نہایت عظیم صدمے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ میری آمد کی اطلاع سن کر میری تعزیت اور غمگساری کے لیے بطور خاص بھابھی کو لے کر اعظم گڑھ سے میرے گھر آئے اور وہی میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ ان کے تاسف کے کلمات یہ تھے: ''عبیدالرحمان کی وفات کی اندوہناک خبر سن کر دل دہل اٹھا۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ زمین پیروں کے نیچے سے کھسک گئی۔ کسی صورت یقین نہیں ہو رہا تھا۔ کئی لوگوں کے پاس اس خبر کی تصدیق کے لیے فون کیا، بالآخر یاسر کی زبانی آنکھوں دیکھا حال سن کر کاتب تقدیر کے فیصلے پر بادل نخواستہ یقین کرنا ہی پڑا۔ مرحوم کو اللہ تعالی اپنی رحمت اور مغفرت سے نوازے اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے آمین۔ طارق صاحب کے لیے بہت بڑا حادثہ ہے اور ایک گہرا ناقابل تلافی صدمہ ہے۔ اللہ انھیں اور ان کے اہل وعیال کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔''

ان کے مزاج اور طبیعت کی حلاوت نے مجھے بے حد متاثر کیا، مجھے ان سے دلی عقیدت اور محبت تھی۔ ان کی تابناک زندگی کے بعض قابل تقلید اور روشن پہلو اور بعض قیمتی یادیں حوالہ قرطاس ہیں۔ بلاشبہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن وہ اپنے طبی، علمی، ادبی اور ملی کارناموں سے عرصہ دراز تک یاد رکھے جائیں گے۔ اللہ

تعالی ان کی سیآت کو حسنات میں تبدیل کردے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا کرے، ان کے ورثاء اور متعلقین کو صبر و استقامت سے نواز کر ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور باشندگان بلریا گنج اور اس کے قرب و جوار کو ان کا نعم البدل عطا کرے آمین۔ ان کا انتقال شہر اعظم گڑھ میں ان کی رہائش گاہ پر ہوا۔ اعظم گڑھ سے ان کا جسد خاکی آبائی وطن بلریا گنج لایا گیا۔ گیارہ مئی اٹھائیس رمضان بروز منگل نو بجے صبح عالیہ پبلک اسکول میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اپنی ابدی آرام گاہ میں والدین کے پہلو میں سپرد خاک کردیے گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ اللہ سبحانہ تعالی کا ارشاد ہے:

’لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ تعالی مہربان ہوتا ہے۔‘ (سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۰۷)۔ عالم بھیا اس آیت کریمہ کی عملی تصویر تھے۔ **اللھم اغفر لہ وارحمہ، وعافہ واعف عنہ، وأکرم نُزُلہ ووسع مُدخلہُ۔**

●⧉●

ذیل کے عکس پر پہلی نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں قدیم لاطینی رسم الخط میں لکھی ہوئی کوئی عبارت ہے۔ جب کہ حقیقت میں یہ آیت بسم اللہ اور سورہ فاتحہ کی خطاطی ہے۔ ایک تیونسی خطاط نے ماہرانہ طریقے سے خطاطی اس انداز سے کی ہے کہ پہلی نظر میں وہ لاطینی رسم الخط میں لکھی ہوئی کوئی عبارت معلوم ہوتی ہے۔ غور سے دیکھنے پر بسم اللہ اور سورہ فاتحہ صاف پڑھی جاسکتی ہے۔ سبحان اللہ۔

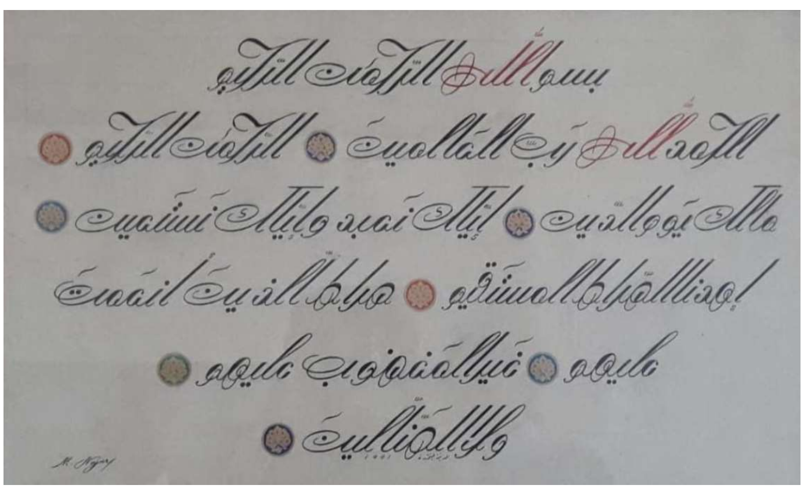

اخبار جامعہ

مصباح الاسلام فلاحی

جامعہ میں داخلہ، تجدید داخلہ اور آغاز تعلیم

تعطیل رمضان وعید کے بعد ۱۴؍مئی ۲۰۲۲ء بروز شنبہ جامعہ میں ضمنی امتحان اور بیک پیپر کا آغاز ہوا۔ ۲۱؍مئی ۲۰۲۲ء بروز شنبہ جامعہ میں نئے تعلیمی سیشن کا آغاز ہوا۔ ثانوی وحفظ میں ۱۵؍مئی ۲۰۲۲ء بروز یکشنبہ نئے داخلہ کا آغاز ہوا، داخلہ کا سلسلہ مئی کے آخر تک جاری رہا۔ اسی طرح شعبہ اعلیٰ طلبہ وطالبات میں ۲۴؍مئی ۲۰۲۲ء کو پہلا داخلہ اور ۲۸؍مئی کو دوسرا ٹیسٹ ہوا۔ دونوں ٹیسٹ میں کامیاب ہونے والے طلبہ وطالبات کی تعداد کلاس وائز مندرجہ ذیل ہے:

اعلیٰ طلبہ: عربی اول ۲۸، عربی دوم ۳، عربی ہفتم ۱۔ (مجموعی تعداد ۳۲) اعلیٰ طالبات: عربی اول ۵۱، عربی دوم ۸، عربی سوم ۳، عربی چہارم ۵، عربی پنجم ۲، عربی ہفتم ۱ (مجموعی تعداد ۷۰)

اعلیٰ طلبہ: عربی اول ۲۰، عربی دوم ۱، (مجموعی تعداد ۲۱) اعلیٰ طالبات: عربی اول ۱۵، عربی پنجم ۱ (مجموعی تعداد ۱۶)۔

۲۱؍مئی سے تجدید داخلہ کی کاروائی شروع کی گئی اور تعلیم کا آغاز ۲۵؍مئی ۲۰۲۲ء سے ہوا۔

درجہ اعدادیہ کا آغاز

اس سال جامعہ میں درجہ اعدادیہ کا آغاز ہوا۔ اعدادیہ کے امیدوار طلبہ وطالبات کا جائزہ کے بعد اعدادیہ میں داخلہ ہوا۔ اس وقت اعدادیہ میں پچاس (۵۰) طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

شعبہ حفظ میں نیا نظام نافذ

اس سال شعبہ حفظ میں نیا نظام نافذ ہوا۔ اردو، ہندی اور انگریزی کا لوڈ کم کیا گیا ہے اور قرب وجوار کے طلبہ کے لیے بورڈنگ میں رہنا لازم کیا گیا۔ چنانچہ اس وقت تقریباً ایک سو طلبہ شعبہ حفظ کی بورڈنگ میں مقیم ہیں۔ جب کہ بلریا گنج کے طلبہ کو وقتی طور پر اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ دوسو طلبہ شعبہ حفظ میں زیر تعلیم

ہیں۔ شعبہ حفظ کے اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ درجہ میں پڑھیں گے۔

نو وارد طلبہ کے سرپرستوں کے ہمراہ ایک نشست

۲۴؍مئی ۲۰۲۲ء بروز سہ شنبہ ابواللیث ہال میں بعد نماز عصر ایک نشست ہوئی جس میں دور دراز سے آنے والے مہمانوں نے شرکت کی۔ نشست کا آغاز قاری محمد شاکر قاسمی صاحب کی تلاوت قرآن سے ہوا۔

مہتمم تعلیم وتربیت مولانا ڈاکٹر جاوید سلطان فلاحی صاحب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا: آپ لوگ اپنے علاقے کے مدارس کو خیرباد کہہ کر جامعہ میں اپنے بچے لائے اس کے لیے آپ شکریہ کے مستحق ہیں۔ ہم کو ملال ہے کہ آپ کی بہتر طریقے سے ضیافت نہیں کر سکے، یہ مسائل وقتی ہیں ان شاء اللہ ان پر قابو پانے کی کوشش کی جائے گی اور بہترین تعلیم وتربیت کے لیے ہم جد وجہد کریں گے۔ آپ کے بچے ہمارے بچے ہیں ہم انہیں سنوارنے کی کوشش کریں گے اور بہترین ماحول فراہم کریں گے۔

نگرانِ اعلیٰ جناب مولانا عبدالعظیم فلاحی صاحب نے فرمایا کہ دینی ودنیاوی دونوں علم ہمارے لیے ضروری ہیں اس لیے ہم اسے نافع بنانے کی کوشش کریں گے۔ ہمارے اس کیمپس میں کسی طرح کی علاقائی اور مسلکی عصبیت نہیں ہے، ملت میں جو خلا نظر آرہا ہے ہم لوگ اس کو پر کرنا چاہتے ہیں۔ اس جامعہ میں طلبہ اور اساتذہ میں کوئی دوری نہیں پائی جاتی ہے بلکہ طلبہ کو بولنے اور سوال کرنے پر ابھارا جاتا ہے۔

ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے کلمات تشکر میں جامعہ کے مقاصد کا ذکر کیا۔ سرپرست حضرات کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دیں اور قربانی دیں۔ جب آپ کے اندر قربانی کا جذبہ ہوگا تو کم وسائل میں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اس لیے بچوں سے ربط رکھیں اور ان کی تربیت پر زور دیں۔

نظامت کے فرائض معاون مہتمم مولانا عبیداللہ طاہر فلاحی صاحب نے انجام دیے۔ پروگرام کے اختتام پر عصرانہ کا بھی نظم کیا گیا۔

تعزیتی نشست سابق ناظم جامعہ کی وفات پر تعزیتی نشست

یکم جون ۲۰۲۲ء ابواللیث ہال میں ایک تعزیتی نشست سابق ناظم جامعہ مولانا ابوالبقاء ندوی مرحوم کے سلسلے میں منعقد ہوئی۔

قاری مجیب الرحمن (استاذ شعبہ حفظ) کی تلاوت سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی

صاحب نے تعزیتی کلمات میں فرمایا کہ مولانا مرحوم سے میرا بہت قریبی تعلق رہا ہے۔مولانا مرحوم کی ایک خوبی یہ تھی کہ اگر وہ کسی کام کو صحیح سمجھ لیتے تھے تو اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی انتھک کوشش کرتے تھے۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ آپ کے تعلقات بہت وسیع تھے اسی لیے آپ کے جنازے میں ایک جم غفیر نے شرکت کی۔آپ اخیر وقت تک جامعہ سے منسلک رہے اور مختلف ذمہ داریوں پر فائز رہے۔

مہتمم تعلیم وتربیت ڈاکٹر جاوید خاں سلطان فلاحی نے تعزیتی کلمات میں فرمایا کہ مولانا مرحوم ایک مشفق اور رحم دل شخصیت کے مالک تھے۔جامعہ سے بہت ہمدردانہ تعلق رکھتے تھے، جامعہ کی مختلف ذمہ داریوں پر فائز رہے ہیں۔مولانا مرحوم ہمیشہ جامعہ کی ترقی کے سلسلے میں سوچتے تھے اور مجھ سے اس تعلق سے ہمیشہ گفتگو کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔(آمین)

صدر مدرس مولانا انیس احمد مدنی نے تعزیتی کلمات میں فرمایا کہ مولانا مرحوم کے چند نمایاں اوصاف تھے۔ مولانا مرحوم کا جامعہ سے والہانہ تعلق تھا اور وہ بہت ہی کفایت شعار تھے۔اس لیے اکثر غیر ضروری کاموں پر اظہار نکیر کرتے تھے۔آپ بہت ہی امانت دار تھے۔مولانا مرحوم کا تعلیم سے بھی لگاؤ تھا اس لیے وہ تعلیم گاہ کی طرف آتے تھے اور تعلیمی مسائل سے دلچسپی بھی لیتے تھے اور ذمہ داروں کو اس جانب متوجہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔(آمین)

حافظ ریاض احمد (استاد شعبہ ثانوی) نے تعزیتی کلمات میں فرمایا کہ مولانا مرحوم ایک سچے اور مخلص انسان تھے، اور بہت اصول پسند اور مضبوط ارادوں کے حامل تھے، انتظامی امور کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔اللہ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔(آمین)

مولانا ابوالبقاء ندوی مرحوم کے صاحبزادے محمد اشہد نے فرمایا کہ والد صاحب بہت انصاف پسند تھے اور ہم بھائیوں کے درمیان انصاف کی بات کرتے تھے۔تعلیم سے ان کی خاص دلچسپی تھی۔مختلف جگہوں پر ان کے پروگرام بھی منعقد ہوتے تھے۔

مولانا شاہد کریم فلاحی (استاد جامعہ) نے فرمایا کہ میں جو کچھ بھی ہوں اس میں مولانا مرحوم کا کردار بہت اہم ہے کیونکہ مولانا مرحوم نے مجھے نظامت سے شعبہ اعلیٰ میں منتقل کیا اور اسی طرح مولانا مرحوم نے میرے کاغذات جامعۃ الامام، ریاض بھیجے اور میں نے اس طرح جامعۃ الامام ریاض سے تعلیم مکمل کی۔نظامت

کے فرائض نگرانِ اعلیٰ مولانا عبدالعظیم فلاحی نے انجام دیے۔

جامعہ میں سلطنت عمان کے ایک وفد کا دورہ

۲؍جون ۲۰۲۲ء کو میں ایک پروگرام سلطنت عمان کے ایک چار رکنی وفد کی آمد پر منعقد ہوا۔
یاسین منظور کشمیری متعلم عربی ششم کی تلاوت قرآن سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ محمد عمر اشرفی اور ان کے ساتھیوں نے عربی زبان میں ترانہ پیش کیا۔ ڈاکٹر عطاء الرحمن فلاحی نے ''اضواء علی مساھمات العلماء والادباء العمانیین'' کے عنوان پر ایک تفصیلی مقالہ پیش کیا۔ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی صاحب نے مہمان دکتور عبداللہ بن سعید خلفان المعمر ی کا تعارف کرایا۔
مہمان خصوصی دکتور عبداللہ بن سعید بن خلفان المعمر ی نے ''آداب طالب العلم'' کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے علم کے طالب کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ حضرت آدم کو فرشتوں نے سجدہ کیا صرف علم کی وجہ سے۔ علم کا حصول ایک دینی فریضہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے علم کے حصول پر توجہ دی ہے۔ علم کے آداب میں سے یہ ہے کہ علم پر ہم خود عمل کریں، اپنے اندر اخلاص پیدا کریں۔ علم کے آداب میں سے یہ ہے کہ ہم اپنے علم کو جاہ و مرتبہ و مقام حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔ علم کی زکاۃ عمل ہے۔ اسی لیے جو علم ہم نے حاصل کیا ہے اس کو دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ حصول علم کے لیے سخت محنت کرنا ضروری ہے۔ دن رات ایک کرنا پڑے گا تب جا کر تھوڑا سا علم حاصل ہوگا۔ علم سے حسن اخلاق پیدا ہوتا ہے۔
کلمۂ تشکر مولانا انیس احمد مدنی (صدر مدرس) نے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض مولانا ذکی الرحمن غازی فلاحی نے انجام دیے۔
اسی طرح کلیۃ البنات نسواں میں ''دور المرأۃ فی صحوۃ الامۃ'' کے عنوان پر ایک لیکچر دکتور عبداللہ بن سعید بن خلفان المعمر ی کا ہوا اور شعبہ عالیہ کی طالبات نے اس نشست میں شرکت کی۔

یک روزہ تربیتی پروگرام برائے معلمین ومعلمات

۹؍جون ۲۰۲۲ء کو ابواللیث ہال میں ایک تربیتی پروگرام برائے معلمین ومعلمات صبح ۸ تا ایک ۱؍بجے منعقد ہوا۔ اس تربیتی پروگرام میں جامعہ کے جملہ شعبہ جات کے معلمین ومعلمات نے شرکت کی۔ بطور تذکیر یہ تربیتی پروگرام منعقد ہوا۔ اس طرح کے پروگرام تدریس کے لیے کافی معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔

اس تربیتی پروگرام کا آغاز قاری ابوذر صاحب (استاد شعبہ حفظ) کی تلاوت قرآن سے ہوا۔

تلاوت قرآن کے بعد مولانا ذکی الرحمن غازی فلاحی مدنی کی تذکیر بالقرآن ہوئی۔ مولانا نے 'سورۃ العلق' کی ابتدائی آیات پر سیر حاصل اور عمدہ گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ انسان کو اپنی تخلیق پر غور کرنا چاہیے کہ انسان کس چیز سے بنا ہے۔ اسے اللہ کے آگے سرنگوں ہونا چاہیے۔ انسان اپنی صلاحیت کی بنیاد پر کچھ نہیں کرسکتا ہے۔ سب کچھ اللہ کی طرف سے اسے عطا کیا گیا ہے۔ ناظم جامعہ مولانا طاہر مدنی نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے ایک مثالی استاد کی چند خوبیاں درج ذیل نکات کی شکل میں بیان کیں اور ان پر سیر حاصل اور اچھی گفتگو کی:

(۱) احساس ذمہ داری (۲) تدریس سے والہانہ لگاؤ (۳) شوق مطالعہ (۴) رحم دل ہونا (۵) طریقہ تدریس میں مہارت ہونا (۶) جدت طرازی اور اختراع (۷) نفسیات کا مطالعہ (۸) صبر وتحمل (۹) اپنے درجہ پر کنٹرول رکھنا (۱۰) انصاف کرنا (۱۱) اپنے فرائض کو ایمان داری سے ادا کرنا (۱۲) اپنے طلبہ کے لیے نمونہ ہونا (۱۳) نظم وڈسپلن کا پابند ہونا (۱۴) تعلیم وتربیت کی طرف متوجہ ہونا (۱۵) اللہ سے دعا کرنا۔

ڈاکٹر افضال احمد فلاحی (شبلی کالج) نے ''تدریس کے بنیادی اصول'' پر لیکچر پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ کم وقت میں نتائج حاصل کرنے کے لیے منصوبہ بندی اور پلاننگ ضروری ہے۔ ذہین اور کمزور بچوں میں فرق نہ ہونے دیں، بچوں کے سامنے وہی مثالیں پیش کریں جو بچوں کی ذہنی استعداد کے مطابق ہوں۔ کلاس میں استاد اور بچے دونوں کا بولنا ضروری ہے۔ اپنی ٹیچنگ کو موثر بنانے کی کوشش کریں، کلاس کا ماحول پرسکون ہو، بچوں میں ڈر نہ پیدا کریں، بچوں میں لگن اور دلچسپی پیدا کریں، بچوں کی ہمت افزائی کریں، ہمیشہ محبت سے پیش آئیں، بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھائیں۔

ڈاکٹر شاہد عبدالکریم فلاحی نے ''رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تعلیم وتربیت'' کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ﷺ معلم، مزکی اور مربی ہیں۔ آپ کا تعلیم وتربیت کا طریقہ ہی سب سے بہتر ہے۔ انہوں نے اخلاص، احساس ذمہ داری، درس سے پہلے تمہید کا ہونا، اپنی بات کو دلائل سے آراستہ کرنا، اسلوب الحوار یعنی ڈبیٹ، تعلیمی وسائل کا استعمال، نظری اسلوب کے ساتھ عملی اسلوب کو پیش کرنا اور طلبہ کی استعداد کا خیال رکھنا جیسے نکات پر سیر حاصل گفتگو کی اور ہر نکات کی دلائل کی روشنی میں تشریح کی۔

دوسرے سیشن کا آغاز سابق ناظم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی صاحب کی تذکیر بالحدیث سے ہوا۔ مولانا نے ''انما بعثت معلما، انما بعثت لأتمم مکارم الاخلاق'' کی تشریح کی، پھر آگے فرمایا کہ جو معلم ہو گیا وہ ہمیشہ معلم ہے۔گھر، راستہ، میدان، سونے، جاگنے، کھانے پینے میں بلکہ ہر عمل میں معلم ہے۔ یہ معلم کا وسیع مفہوم ہے۔ایک معلم مربی بھی ہوتا ہے اسی لیے تعلیم کے ساتھ اس میں تربیت بھی داخل ہے۔ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ جس کے دو دن برابر ہوں وہ تباہ ہو جائے۔اس لیے ہر دن اپنے علم میں اضافہ کرنا ضروری ہے۔علم برائے علم کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ علم برائے عمل ہو۔ دنیا کے سب سے بڑے عالم سے کہا گیا: ''رب زدنی علما'' اس پر بھی ذرا غور کیجیے گا۔

اس کے بعد نمونہ کے سبق پیش کیے گئے۔ پہلا نمونہ کا سبق موطا امام مالک کی ایک حدیث کا صدر مدرس مولانا انیس احمد مدنی صاحب نے پیش کیا اور دوسرا نمونہ کا سبق درجہ ششم (ثانوی) کی انگریزی کا ماسٹر عبد الما لک صاحب نے پیش کیا۔

کلمہ تشکر اور اختتامی کلمات مہتمم تعلیم وتربیت مولانا جاوید سلطان فلاحی صاحب نے پیش کیے۔نظامت کے فرائض مصباح الباری صاحب نے انجام دیے۔اخیر میں ظہرانہ کا بھی نظم کیا گیا۔

نئے ذمہ دارانِ جمعیۃ الطالبات کا انتخاب

۲۰ رجون ۲۰۲۲ء بروز دوشنبہ ذمہ داران جمعیۃ الطالبات کا انتخاب عمل میں آیا۔مندرجہ ذیل طالبات کو ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

۱۔سکریٹری	رقیہ شاہد	معاون	رافعہ نعیم
۲۔معتمد خطابت	عظمیٰ اسلم	معاون	اریبہ ارشد، نور الصباح اسماعیل
۳۔معتمد کتابت	عظیمہ شمیم	معاون	ماریہ طارق
۴۔معتمد لائبریری	فلک عبداللہ	معاون	شاکرہ علی قدر
۵۔معتمد رسائل	کلثوم امین	معاون	شگفتہ نسیم
۶۔معتمد کھیل	صدف ناصر	معاون	نازنین عبدالمنعم
۷۔معتمد باغبانی	اضحیٰ فاطمہ	معاون	اریبہ سنبل

جمعیۃ الطلبہ ۲۳ — ۲۲ء کا انتخاب

۲۱ رجون ۲۰۲۲ء کو جمعیۃ الطلبہ کے انتخاب میں ۲۳ — ۲۰۲۲ء کے لیے منتخب ذمہ داران یہ ہیں:

سکریٹری عبدالاحد، لائبریرین محمد عاصم، معتمد رسائل وجرائد امام الدین

معتمد خطابت محمد مبشر، معتمد تحریر نجم الدین، معتمد گیم محمد مزمل

اللہ تعالیٰ تمام نو منتخب ذمہ داران کو اپنی اپنی ذمہ داریاں بخوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جامعہ میں نئی تقرریاں

۲۶ رمئی ۲۰۲۲ء بروز یکشنبہ جامعہ کی مرکزی لائبریری میں مختلف شعبہ جات کے لیے انٹرویو ہوا جس میں مندرجہ ذیل لوگوں کا تقرر عمل میں آیا ہے:

(۱) قاری مجیب الرحمن قاسمی، شعبہ حفظ طلبہ
(۲) حافظ ابوذر، شعبہ حفظ طلبہ
(۳) محترمہ مبشرہ اشہد، شعبہ اعلیٰ طالبات
(۴) محترمہ سائرہ عبدالمتین، شعبہ اعلیٰ طالبات
(۵) محترمہ شاہین شیخ، شعبہ اعلیٰ طالبات
(۶) محترمہ ایمن سکندر، شعبہ اعلیٰ طالبات
(۷) محترمہ انعم علیم، شعبہ ثانوی طالبات
(۸) محترمہ راحلہ عبدالعظیم، شعبہ حفظ طالبات
(۹) محترمہ سائبہ جہانگیر، شعبہ حفظ طالبات
(۱۰) محترمہ ارم فیض، شعبہ ابتدائی طالبات

اللہ تعالیٰ تمام نو واردین کو اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

تقریب تقسیم انعامات

۶ رجولائی ۲۰۲۲ء کو ابواللیث ہال میں ایک تقریب تقسیم انعامات انجمن طلبہ قدیم کی جانب سے منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں گذشتہ سال پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کو انعامات سے نوازا گیا۔ مبشر خاں ساجد (عربی دوم) کی تلاوت قرآن سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ ترانہ جامعہ مجتبیٰ اللہ (عربی ششم) اسد اللہ کاظمی (عربی ششم) اور محمد التمش الماحی (عربی چہارم) نے پیش کیا۔

اس تقریب کے مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر محی الدین غازی تھے۔ آپ زندگی نو کے مدیر اور انجمن طلبۂ قدیم کے شوری کے رکن ہیں۔ مہمان خصوصی نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ وہ طلبہ جو کمزور تھے تھرڈ ڈویژن پاس

ہوتے تھے اگر وہ محنت کرتے ہیں اور پہلی پوزیشن حاصل کرتے ہیں تو یہ سب سے اہم چیز ہے۔آپ کو شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر توجہ دینی ہوگی۔تب ہی آپ کے اندر نکھار پیدا ہوگا۔کامیاب شخص وہ ہے جو غیر ضروری چیزوں کو چھوڑ دے اور اہم وضروری کام فوراً کرے۔دنیا میں وقت کی تنظیم کو سب سے اہم مانا جاتا ہے۔اسی لیے اپنی شخصیت کو نکھارنے کے لیے ایک لسٹ تیار کریں اور ضروری واہم چیزوں کو فوراً کرنے کے لیے اللہ سے دعا کریں اور کوئی کام کل پر ہرگز نہ ٹالیں۔

اس کے بعد شعبہ اعلیٰ کے طلبہ کے مابین اساتذہ کرام کے بدست انعامات تقسیم ہوئے۔

ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ اصل توجہ ہمیں استعداد، صلاحیت ولیاقت بنانے پر دینی چاہیے۔بقیہ چیزیں تو انتظامی امور کی ہیں۔ہر ایک کو اللہ نے ۲۴ گھنٹے دیے ہیں کچھ لوگ اسی میں اپنے اوقات کو منظم کرتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں، اس لیے مسلسل محنت کریں اور اپنے اوقات کو منظم کریں، مواقع کو صحیح استعمال کریں۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے۔

کلمہ تشکر صدر مدرس مولانا انیس احمد مدنی صاحب نے پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ خوشی کا موقع ہے۔ مہمان خصوصی نے جو بات کہی کہ تھرڈ ڈویژن پاس ہونے والے طلبہ آگے بڑھیں یہ بہت اہم بات ہے۔اس لیے آپ آگے بڑھیں، محنت کریں اور اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھائیں۔انعامات حاصل کرنے والے طلبہ مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اپنی بات بہت ہی عمدہ اور اچھے انداز میں پیش کی۔

واضح رہے کہ انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی جانب سے سالانہ امتحان ۲۲–۲۰۲۱ء میں ہر درجے میں پہلی تین پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کو انعامات سے نوازا گیا۔

اخبار انجمن

مسابقہ مضمون نویسی

موضوع: اسلاموفوبیا: چیلنجز اور حل

(بھارت کے تناظر میں)

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح عالمیت اور فضیلت کے طلبہ و طالبات کے لیے مندرجہ بالا عنوان کے تحت مضمون نویسی کا اعلان کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتی ہے۔ شرکاء کو توصیفی سند کے ساتھ دیے جانے والے انعامات کی تفصیل اس طرح ہے:

انعام اول: آٹھ ہزار روپے، انعام دوم: چھ ہزار روپے، انعام سوم: پانچ ہزار روپے.

ان کے علاوہ دیگر چھ امیدواروں کو ایک ایک ہزار روپے کے تشجیعی انعامات سے نوازا جائے گا۔

دیگر تفصیلات و شرائط

۱ — جامعۃ الفلاح کے صرف عالمیت اور فضیلت کے طلبہ و طالبات شرکت کے مجاز ہوں گے۔

۲ — مقالہ کی زبان صرف اردو ہوگی۔

۳ — ہاتھ سے تحریر کردہ مقالہ قابل قبول نہیں ہوگا، بلکہ اسے کمپیوٹر پر MS Word میں تحریر کیا جائے۔ مرکزی عنوان کا فونٹ سائز 24، ذیلی عناوین کا 18 اور متن کے فونٹ کا سائز 14 ہونا چاہیے۔ بین السطور فاصلہ 1.5 ہو۔

۴ — صفحات کی تعداد حواشی و مراجع سمیت کم سے کم 10 اور زیادہ سے زیادہ 15 ہو۔

۵ — مضمون نگار پہلے صفحہ پر اپنا نام ہرگز نہ لکھے، بلکہ ایک الگ ورق پر اپنا نام، تعلیمی درجہ اور فون نمبر نیز دیگر متعلقہ معلومات درج کرے۔

۶ — مقالات صرف جریدہ حیات نو کے ایمیل پر ورڈ اور پی ڈی ایف فارمیٹ میں ارسال کیے جائیں۔ خیال رہے کہ جریدے کا ایمیل ایڈریس اب یہ ہے hayatenau1978@gmail.com۔

۷–مقالہ جمع کرنے کی آخری تاریخ **شنبہ 31 دسمبر 2022** ہے۔

۸–مندرجہ بالا ضوابط کی پابندی نہ کرنے کی شکل میں مقالہ مسترد کیا جاسکتا ہے۔

۹–ججز صاحبان کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

۱۰–معیاری مقالات ’حیات نو‘ میں شائع کیے جائیں گے۔

صدر انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Anjuman Talaba-e-Qadeem Jamiatul Falah

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

Ref No. 08/08/22

Date 23 اگست 2022

تقرر سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

محترم فلاحی برادران!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے اور ہمارے وجود کو ملک وملت کے لیے باعث خیر بنائے۔

سکریٹری انجمن طلبہ قدیم برادر دانش ریاض فلاحی اپنے کچھ ذاتی مسائل اور مصروفیات کے پیش نظر گزشتہ دنوں مستعفی ہو گئے تھے۔ ان کے استعفیٰ کو شوریٰ سے گفتگو ومشورے کے بعد قبول کیا گیا اور اب شوریٰ کے مشورے سے برادر فرحان اجمل فلاحی (حال مقیم حیدرآباد) کا بطور سکریٹری انجمن تقرر کیا جارہا ہے۔

اللہ رب العزت اس تقرر کو انجمن اور فلاحی برادران کے حق میں باعث خیر وبرکت بنائے۔

بقیہ احوال لائق شکر ہیں۔

طالب دعا

Abulaala

ابوالاعلیٰ سید سبحانی

صدر انجمن طلبہ قدیم، جامعۃ الفلاح

Bilariyaganj, Azamgarh, U.P. 276121

atq.jamiatulfalah@gmail.com | www.atqjamiatulfalah.org